زہریلے چاکلیٹ
5231
اشتیاق احمد

سائیں بابا

گھنے درختوں کے درمیان سبز رنگ کا خیمہ دیکھ کر انہیں حیرت ہوئی۔ موسم سرما کا آغاز ہو چکا تھا اور اُن دنوں وہ شام کے وقت بھی سیر کرنے کے لیے گھر سے نکلنے لگے تھے۔ انسپکٹر جمشید نے بھی انہیں اجازت دے دی تھی لیکن ساتھ ہی تاکید کی تھی کہ وہ زیادہ دُور نہ نکل جایا کریں۔

وہ شہر سے ایک میل دُور نکل آئے تھے اور واپس مڑنے کا ارادہ کر ہی رہے تھے کہ وہ سبز خیمہ انہیں نظر آیا ـــــ اس طرف وہ پہلی مرتبہ ہی آئے تھے۔

"معلوم ہوتا ہے، یہ خیمہ کسی بزرگ کا ہے۔" فاروق نے کہا۔

"یہ تو ہم نے بھی دیکھتے ہی اندازہ لگا لیا ـــــ خیمے کے پاس کافی رونق نظر آ رہی ہے ـــــ کوئی اللہ والا معلوم ہوتا ہے۔" محمود نے کہا۔

"آج کل کے اللہ والے بھی جعلی نکل آتے ہیں۔" فرزانہ نے جواب میں کہا۔

"آؤ چل کر دیکھیں۔" فاروق نے کہا۔

"چلو۔" محمود نے آمادگی کا اظہار کیا۔

وہ سڑک سے نیچے اُترے ہی تھے کہ ایک کار عین اسی جگہ آکر رُکی۔ کار سڑک سے نیچے اتار کر روکی گئی تھی۔ وہ ٹھٹک کر رُک گئے ___ کار میں سے دو خوش پوش نوجوان اُتر رہے تھے ___ پھر انہوں نے پچھلی سیٹ پر لیٹے ایک دس گیارہ سالہ لڑکے کو باہر نکالا۔ ایک نے اُسے کندھے پر ڈالا اور خیمے کی طرف چل پڑے ___ اس وقت ان تینوں نے دیکھا کہ لڑکے کے ہاتھ اور پاؤں مڑے ہوئے تھے۔

انہوں نے ایک دوسرے کو عجیب نظروں سے دیکھا اور ان کے پیچھے چلنے لگے۔ انہیں یہ سب کچھ بہت عجیب لگا تھا۔ دونوں نوجوان ٹیٹرون کے سوٹوں میں تھے اور کافی دولت مند دکھائی دیتے تھے ___ ان کی انگلیوں میں قیمتی نگوں والی انگوٹھیاں تھیں۔

خیمے کے دروازے پر چھ سات آدمی باادب بیٹھے تھے۔ چار پانچ کھڑے بھی تھے ___ ایک آدمی سبز کپڑوں میں ملبوس خیمے کے بیچوں بیچ بیٹھا تھا ___ اس کے چہرے پر بہت لمبی سفید ڈاڑھی تھی ___ بھنویں تک سفید تھیں۔ چہرے پر جھریاں تھیں۔ اس کے سامنے ایک نوجوان ادب سے بیٹھا کچھ کہہ رہا تھا ___ کہ وہ دونوں لڑکے کو لیے خیمے کے دروازے پر پہنچے۔

"سائیں بابا ___" ان میں سے ایک کے منہ سے نکلا۔ بوڑھے نے چونک کر نظریں اٹھائیں ... اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہی وہ تینوں کانپ اُٹھے۔ آنکھیں خون کی مانند سُرخ تھیں۔

"کیا بات ہے بچو۔" اس نے ان دونوں نوجوانوں سے کہا۔

"جی ___ یہ بچہ بھی اسی عجیب و غریب بیماری کا شکار ہو گیا ہے ..... جس قسم کے ایک بچے کا علاج آپ نے دو دن پہلے کیا تھا۔"

"تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ ہم نے دو دن پہلے کسی بچے کا علاج کیا تھا۔" سائیں بابا نے بارُعب آواز میں کہا۔

"جی ___ سارے شہر میں یہ خبر گشت کر رہی ہے ___ ہر طرف آپ کا ہی چرچا ہے۔"

"لیکن ہم ہر کسی کا علاج نہیں کرتے ___ جاؤ پھر کسی وقت آنا۔"

"لیکن ہمارا بچہ ___ دیکھیے تو سہی ___ یہ چل پھر بھی نہیں سکتا۔ ہاتھوں سے کوئی چیز نہیں پکڑ سکتا۔"

"ہاں! مجھے نظر آتا ہے، میں اندھا نہیں ہوں۔"

"بابا ___ ہم آپ کی خدمت کریں گے۔"

"مجھے اپنی خدمت کرانے کا کوئی شوق نہیں ___ خیر تم بچہ آگے لے آؤ ___ اسے چٹائی پر لٹا دو۔"

انہوں نے ایسا ہی کیا۔ سائیں بابا نے اس کے ہاتھوں اور پاؤں کو دیکھا۔ چھوٹی سی ایک ڈبیہ کھولی ___ اس میں راکھ کی شکل کی کوئی چیز تھی ___ اس کی ایک چٹکی لڑکے کے منہ میں ڈال دی۔ پھر

مٹی کے پیالے میں اسے اپنے ہاتھ سے پانی پلایا — اس کے بعد کئی منٹ تک کچھ پڑھ پڑھ کر اس پر پھونکتا رہا۔ پھر ان سے بولا:

"یہ فقیر کی راکھ کی چٹکی کام دکھائے گی — اگر تم نے کنجوسی سے کام نہ لیا — گھر جا کر غریبوں میں کھانا تقسیم کرنا —"

"جی بہتر —"

"بس اب اسے لے جاؤ — چلو بیٹا! اپنے پاؤں پر کھڑے ہو جاؤ —" بابا نے لڑکے سے کہا — لڑکے نے اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی کوشش کی فوراً ہی اس کے منہ سے خوشی کی ایک چیخ نکلی۔

دوسرے ہی لمحے ان سب کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ لڑکا اپنے پاؤں پر سیدھا کھڑا ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا — اس نے اپنے ہاتھوں کو جنبش دی — وہ بھی سیدھے ہو گئے۔

"ابا جان — میں بالکل ٹھیک ہوں۔" اس کے منہ سے نکلا۔

"خدا کا شکر ہے — بابا — ہم آپ کی کیا خدمت کریں؟"

"مجھے کسی چیز کی خواہش نہیں۔" سائیں بابا نے کہا۔

"پھر بھی — آپ جو کہیں گے، ہم حاضر کریں گے۔"

"فقیروں کو دنیا داری سے کیا کام — بس اب تم جاؤ — اور جا کر غریبوں میں کھانا تقسیم کرو۔"

"نہیں بابا — ہم آپ کی خدمت کیے بغیر نہیں جائیں گے — آپ نے ہم پر اتنا بڑا احسان کیا ہے — ہم نے بڑے سے بڑے

ڈاکٹر کو اسے دکھایا — انہوں نے سینکڑوں دوائیاں اسے دیں لیکن ذرہ بھر بھی فائدہ نہ ہوا — اور آپ نے دیکھتے ہی دیکھتے اسے ایک راکھ کی چٹکی سے ٹھیک کر دیا — یہ تو معجزہ ہے معجزہ — یہ ہماری طرف سے قبول فرمائیے۔" ان میں سے ایک نوجوان نے چند سبز نوٹ سائیں بابا کی چٹائی کے نیچے کھسکا دیے — سائیں بابا نہیں نہیں کرتا رہ گیا لیکن دونوں نے اس کی ایک نہ سنی اور خیمے سے نکل گئے —

ان تینوں نے صاف دیکھا کہ وہ سو سو روپے کے کئی نوٹ تھے۔

۶

انسپکٹر جمشید کے فون کی گھنٹی بجی۔ انہوں نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا اور بولے:

"ہیلو — کون صاحب؟"

"تم ذرا میرے ہاں آ جاؤ — میں بہت پریشان ہوں۔" دوسری طرف سے خان رحمان کی آواز سنائی دی۔

"کیا ہوا — خیریت تو ہے؟" انسپکٹر جمشید نے گھبرا کر پوچھا۔

"نہیں — خیریت کہاں ہے — بس تم آ جاؤ — دفتر کا وقت تو ختم ہونے ہی والا ہے۔"

"میں آ رہا ہوں۔" انہوں نے فکر مند ہو کر کہا، کیونکہ خان رحمان

کسی معمولی بات پر فکر مند ہونے والے نہیں تھے۔ وہ ان کے بہت ہی
گہرے دوستوں میں سے ایک تھے۔ ریٹائرڈ فوجی تھے اور بہت خوش
مزاج طبیعت کے مالک تھے۔

انسپکٹر جمشید وہاں پہنچے تو دم بخود رہ گئے۔ خان رحمان کا ملازم انہیں
لیے ایک کمرے میں آیا تھا۔۔۔ کمرے میں تین چار ڈاکٹر موجود تھے۔
ان کا بڑا لڑکا حامد پلنگ پر لیٹا تھا۔ اس کے ہاتھ اور پاؤں مڑے
ہوئے تھے۔ کمرے کے دوسرے کونے میں خان رحمان کی بیوی، دوسرے
بچے سرور اور ناز کھڑے تھے۔

"اسے کیا ہوا؟" کمرے میں موجود لوگ انسپکٹر جمشید کی آواز سن
کر چونک اٹھے۔

"صبح سے اس کی یہی حالت ہے۔۔۔ چل پھر نہیں سکتا۔۔۔ پیر اور
ہاتھ مڑ گئے ہیں۔"

"صبح سویرے کیا یہ بالکل ٹھیک تھا؟"

"ہاں۔۔۔ صبح بالکل ٹھیک تھا۔۔۔ تینوں بچے ناشتا کر کے سکول
گئے تھے۔۔۔ پھر مجھے سکول کا فون ملا۔۔۔ کہ حامد کی طبیعت خراب ہے۔
میں کار لے کر وہاں پہنچا اور تینوں کو گھر لے آیا۔ اب صبح سے
ڈاکٹر پہ ڈاکٹر آ رہے ہیں لیکن کسی کی دوائی نے کوئی کام نہیں
کیا۔۔۔ میں نے تمہیں اس خیال سے بلا لیا کہ شاید کوئی مفید مشورہ
دے سکو۔۔۔ کوئی ڈاکٹر تجویز کر سکو۔۔۔"

"تم نے اچھا کیا۔۔۔ کیا پروفیسر داؤد کو فون کیا؟"

"نہیں تو۔۔۔ بھلا وہ کیا کریں گے۔۔۔ وہ تو سائنس کے ڈاکٹر ہیں۔"

"میرا خیال ہے انہیں بھی بلا لینا چاہیے۔"

"اچھا۔۔۔ میں فون کیے دیتا ہوں۔" خان رحمان مڑے ہی تھے
کہ ایک ڈاکٹر بولا۔

"خان صاحب۔۔۔ یہ مرض ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔۔۔ آپ
انہیں کسی اور ڈاکٹر کو دکھائیں۔ ہمیں افسوس ہے۔"

"اوہ۔۔۔" وہ صرف اتنا ہی کہہ سکے۔۔۔

ڈاکٹروں نے اپنے بیگ اٹھائے اور ان کے ساتھ کمرے سے
چلے گئے۔

"صبح اس نے کیا کھایا تھا۔" انہوں نے شہناز بیگم سے پوچھا۔

"انڈا۔۔۔ مکھن اور توس۔۔۔ چائے کی دو پیالیاں۔۔۔ یہی ان
دونوں نے بھی کھایا تھا۔" انہوں نے بتایا۔

"کیا یہ بات کر سکتا ہے؟"

"ہاں۔۔۔ ویسے یہ اپنے ہوش میں ہے۔۔۔ بول سکتا ہے۔۔۔
پلنگ پر اٹھ کر بیٹھ سکتا ہے۔۔۔ بس چل پھر نہیں سکتا اور ہاتھوں
میں کوئی چیز نہیں پکڑ سکتا۔"

"کیوں بیٹے۔۔۔ گھر سے باہر بھی تم نے کچھ کھایا تھا؟"

"جی۔۔۔ ہاں انکل۔۔۔ ہم تینوں نے چاکلیٹ کھائے تھے۔"

"اور کچھ — کوئی پھل وغیرہ —"

"جی نہیں۔"

"ہوں —"

اتنے میں خان رحمان اندر داخل ہوئے:۔

"ڈاکٹر اپنی اپنی فیس لے کر چلے گئے ہیں — میں نے پروفیسر داؤد کو فون کر دیا ہے — وہ پہنچ رہے ہیں۔"

"اس وقت تک ڈاکٹروں نے کیا کچھ کیا ہے —" انسپکٹر جمشید نے پوچھا۔

"ڈاکٹر اس کا خون ٹیسٹ کر چکے ہیں — خون میں انہیں کسی خرابی کا پتا نہیں چلا — اس کے علاوہ انہوں نے انجکشن لگائے ہیں — دو تین قسم کے مکسچر دیے ہیں — مرض کسی کی بھی سمجھ میں نہیں آیا۔"

"عجیب بات ہے — کیا کوئی نیا مرض معرضِ وجود میں آ رہا ہے۔"

"سُنا ہے — شہر میں اس قسم کے دو تین اور کیس بھی ہو چکے ہیں۔"

"یہ کس سے سُنا ہے؟"

"ظہور سے۔"

"ذرا اُسے بلاؤ۔"

خان رحمان نے اپنے ملازم کو آواز دی — یہ ان کا خاص ملازم

تھا۔ ایک ادھیڑ عمر آدمی —

"کیا تم نے کسی اور بچے کو اس مرض میں مبتلا دیکھا ہے۔" انسپکٹر جمشید نے اس کے کمرے میں داخل ہونے کے بعد پوچھا۔

"جی نہیں — اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا — البتہ سُنا ضرور ہے۔"

"کس سے سنا ہے —"

"بازار میں سودا سلف لینے گیا تھا — وہاں ایک جگہ کچھ لوگ جمع تھے، میں بھی وہاں کھڑا ہو گیا — وہ ایک لڑکے کے بارے میں باتیں کر رہے تھے — جس کے ہاتھ پیر مڑ گئے تھے اور جنگل کے کسی سائیں بابا نے دیکھتے ہی دیکھتے اس کا علاج کر دیا تھا —"

"جنگل کے کسی سائیں بابا نے — کیا مطلب۔" انسپکٹر جمشید نے حیران ہو کر کہا۔

"جی ہاں — ان دنوں شہر میں ایک سائیں بابا آئے ہوئے ہیں — انہوں نے اپنا خیمہ جنگل میں لگایا ہوا ہے — شہر سے تقریباً ڈیڑھ میل کے فاصلے پر اکبر روڈ کے دونوں طرف گھنے جنگل ہیں نا — بس وہیں کہیں اس نے خیمہ لگایا ہوا ہے — یہ سب کچھ میں نے دیکھا نہیں — صرف سُنا ہے۔"

"یہ تو گھڑی ہوئی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔" انسپکٹر جمشید خان رحمان کی طرف مڑے۔

"اور کیا — ظہور نے صبح مجھ سے کہا تھا کہ میں حامد کو اس سائیں کے پاس لے جاؤں — جس پر مجھے ہنسی آ گئی تھی —"

"ٹھیک ہے ظہور — تم جاؤ — اور ہاں دیکھو — پروفیسر داؤد آنے والے ہیں — انہیں سیدھے یہیں لے آنا۔" خان رحمان نے کہا۔

"جی اچھا۔"

ظہور کمرے سے نکلا ہی تھا کہ دروازے کی گھنٹی بجی۔

"یہ ضرور پروفیسر داؤد ہوں گے۔" خان رحمان بولے۔

"ہاں — خیال تو یہی ہے۔"

پھر پروفیسر داؤد کمرے میں داخل ہوئے۔

"تم نے مجھے صبح ہی فون کیوں نہ کیا۔" وہ آتے ہی بولے۔

"اس کا خیال تھا کہ آپ سائنس کے ڈاکٹر ہیں — جسموں کے نہیں۔"

"لیکن سائنس کا تعلق ہمارے جسموں سے بھی تو ہے — یہ کہہ کر وہ حامد کی طرف بڑھے۔

انہوں نے اس کی آنکھوں کے پپوٹے اٹھا کر دیکھے — نبض دیکھی — ہاتھ پیروں کو ہلا جلا کر دیکھا۔

"سب کچھ ٹھیک ہے۔ نبض بھی اور ہاتھوں پیروں کے جوڑ بھی — خون کی رپورٹ کیا کہتی ہے۔"

"خون میں کوئی خرابی نہیں ہے۔"

"خون میں کسی قسم کے جراثیم بھی نہیں پائے گئے۔" انہوں نے پوچھا۔

"یہ تو مجھے معلوم نہیں۔" خان رحمان نے جواب دیا۔

"یہی بات تو معلوم کرنے والی ہے — خیر تم حامد کو کار میں پہنچاؤ — ہم اسی وقت جراثیم کے ایک ماہر کے پاس جائیں گے۔"

"کون ہے وہ —" خان رحمان بولے۔

"ڈاکٹر ادریس —" پروفیسر داؤد نے جواب دیا۔

"کیا وہ آپ کا دوست ہے۔" انسپکٹر جمشید نے پوچھا۔

"نہیں دوست تو نہیں — البتہ وہ مجھے جانتا ہے اور میں اسے۔"

"کیا آپ کا خیال ہے، وہ حامد کا علاج کر سکے گا —"

"نہ کر سکا تو کوئی مشورہ ضرور دے سکے گا۔"

"تو پھر چلیے۔"

ظہور کو بلایا گیا — اس نے حامد کو کندھے پر ڈال کر کار تک پہنچایا — تینوں کار میں بیٹھ گئے — خان رحمان پچھلی سیٹ پر حامد کے ساتھ بیٹھے — انسپکٹر جمشید نے سٹیرنگ سنبھال لیا

"اب آپ بتائیے — چلنا کس طرف ہے۔" انہوں نے ساتھ

بیٹھے پروفیسر داؤد سے کہا۔
جونہی وہ گھر سے باہر نکلے۔ اندر فون کی گھنٹی بجنے لگی۔

جراثیم کا ماہر

ظہور فون کی طرف لپکا۔ اس نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا:

"جی کون صاحب۔"

"ظہور — میں محمود ہوں — میرے ابا جان یہاں تو نہیں ہیں۔"

"جی ہاں یہیں تھے — ابھی ابھی صاحب کے ساتھ کہیں باہر گئے ہیں — شاید ابھی دروازے پر ہی ہوں — کیا بلاؤں۔"

"ہاں! اگر ابھی گئے نہ ہوں تو بلا دو۔"

"اچھا۔"

ظہور دروازے کی طرف دوڑا — لیکن کار جا چکی تھی۔ اس نے واپس آ کر ریسیور میں کہا:

"جی وہ کہیں چلے گئے ہیں۔"

"کہاں — کیا تمہیں نہیں معلوم۔"

"جی — وہ حامد کو کسی ڈاکٹر کے پاس لے کر گئے ہیں۔"

"کیوں — حامد کو کیا ہوا —"

"ایک عجیب و غریب بیماری — اُن کے ہاتھ اور پاؤں مُڑ گئے

ہیں۔"

"کیا!" محمود چلایا۔

"جی ہاں — صبح سے ڈاکٹر پر ڈاکٹر آئے لیکن انہیں کوئی فرق نہیں پڑا — پھر صاحب نے تمہارے والد کو یہاں بلالیا — پھر پروفیسر داؤد آئے — اور اب وہ تینوں انہیں لے کر کسی ڈاکٹر کے پاس گئے ہیں۔"

"اوہ — اچھا وہ آئیں تو انہیں کہنا مجھے فون کرلیں۔"

"جی بہتر۔"

محمود نے فون کا ریسیور رکھ دیا

"کیا بات ہے — محمود — کیا تمہارے ابا جان مل گئے۔" بیگم شیرازی نے پوچھا جن کے مکان سے محمود فون کرنے آیا تھا۔

"جی ہاں — وہ خان رحمان کے گھر ہیں۔"

"یہ تمہارے والد کے دوست ہیں؟"

"جی ہاں!"

یہ کہہ کر محمود وہاں سے چلا آیا۔

"کیوں ملے ابا جان۔" فرزانہ نے بے چینی سے پوچھا — شام کے سات بج رہے تھے اور وہ ابھی تک نہیں لوٹے تھے اسی لیے تینوں بچے اور بیگم جمشید پریشان ہو گئے تھے — محمود شیرازی صاحب کے ہاں ادھر ادھر فون کرکے پتا کرنے گیا تھا۔

"ہاں — ابا جان خان رحمان کے گھر گئے تھے۔" اس نے بتایا۔

"گئے تھے — کیا اب وہاں نہیں ہیں؟"

"نہیں — اب وہ حامد کو لے کر کسی ڈاکٹر کے پاس گئے ہیں۔"

"کیوں — حامد کو کیا ہوا —"

"وہی بیماری — جس میں صبح ہم نے اس لڑکے کو مبتلا دیکھا تھا۔"

"کیا!" فرزانہ اور فاروق حیرت سے چلائے۔

"ہاں — اس بیماری کا حملہ حامد پر صبح ہوا تھا — کوئی ڈاکٹر اس وقت تک اس کا علاج نہیں کر سکا۔ اب خان رحمان ابا جان اور پروفیسر داؤد اسے ایک اور ڈاکٹر کے پاس لے گئے ہیں۔ غالباً اس ڈاکٹر کے پاس پروفیسر انکل نے چلنے کا مشورہ دیا ہوگا۔"

"کمال ہے — یہ کیسی بیماری ہے۔" فرزانہ بولی۔

"تم کس بیماری کا ذکر کر رہے ہو۔" بیگم جمشید نے حیران ہو کر پوچھا۔

محمود نے جو کچھ صبح دیکھا تھا انہیں بتا دیا۔

"کمال ہے — اس سائیں نے راکھ کی ایک چٹکی سے اسے ٹھیک کر دیا — اور حامد کا علاج کوئی ڈاکٹر نہیں کر سکا۔" فاروق بولا۔

"تو حامد کو بھی اس کے پاس لے جاؤ۔" بیگم جمشید بولیں۔

"اب وہ واپس آئیں گے تو جا سکیں گے نا ــــ انہیں اُس سائیں بابا کے متعلق کیا معلوم ــــ یہ تو اتفاق سے ہمیں معلوم ہو گیا ہے۔"

"ہوں ــــ ویسے بھی اب رات ہو چکی ہے ــــ" فرزانہ نے کہا۔

"نہ جانے ــــ تمہارے ابا جان کب لوٹیں ــــ تم یوں کرو ــــ مکان کے تمام دروازے اور کھڑکیاں اندر سے بند کر لو۔"

"جی بہتر۔"

تینوں اُٹھ کھڑے ہوئے۔

۶

ڈاکٹر ادریس نے انہیں حیرت سے پلکیں جھپکا کر دیکھا۔ یہ ایک نوجوان اور خوبصورت آدمی تھا۔ آنکھوں پر عینک تھی۔

"فرمائیے!" اس نے دروازے پر ہی پوچھا۔

"ہم اس بچے کو دکھانے کے لیے لائے ہیں۔"

"لیکن میں کوئی ڈاکٹر نہیں ہوں۔"

"لیکن آپ جراثیم کے ماہر ضرور ہیں۔"

"کیا مطلب ــــ آپ کو کیسے معلوم ہوا۔" ڈاکٹر ادریس نے حیران ہو کر پوچھا۔

"مجھے پروفیسر داؤد کہتے ہیں۔" پروفیسر مسکرائے۔

"ارے! آپ ــــ آئیے ــــ اندر آجائیے ــــ لیکن اس بچے کو ہوا کیا ہے ــــ اور مجھ سے اس بیماری کا کیا تعلق ہے۔" وہ انہیں راستہ دیتے ہوئے بولا۔

"تعلق ــــ ہاں میرا خیال ہے، تعلق ہے۔" پروفیسر داؤد بولے۔

وہ انہیں ڈرائنگ روم میں لے آیا۔

"ہاں اب فرمائیے ــــ اسے کیا ہوا۔"

"ذرا اس کے ہاتھ اور پیر دیکھیے ــــ یہ کس طرح مڑ گئے ہیں۔ ڈاکٹروں کی سمجھ میں اس کا مرض نہیں آیا ــــ وہ اپنی سی کر کے دیکھ چکے ہیں ــــ میرا خیال ہے کچھ خاص قسم کے جراثیم اس پر اثر انداز ہوئے ہیں ــــ جو ڈاکٹروں کو خون ٹسٹ کرنے پر معلوم نہیں ہو سکے ــــ آپ اس کے خون کا معائنہ کریں ــــ شاید کچھ پتا لگ سکے۔"

"اوہ! یہ بات ہے ــــ میرا خیال ہے پروفیسر صاحب آپ ٹھیک ہی کہہ رہے ہیں ــــ میں ابھی چند منٹ کے اندر ہی بتائے دیتا ہوں۔" ڈاکٹر ادریس اٹھتا ہوا بولا۔ اس نے سرنج نکالی احمد کا خون لیا اور کمرے سے نکل گیا۔

"اگر یہ معلوم ہو جائے کہ اس پر کچھ خاص قسم کے جراثیم حملہ آور ہوئے ہیں تو کیا مرض کا علاج کیا جا سکتا ہے؟" انسپکٹر جمشید نے

پوچھا۔

"ہاں ـــ فوراً ـــ لیبارٹری میں ان جراثیم پر مختلف قسم کی دوائیں آزمائی جائیں گی ـــ جس دوائی سے وہ مر جائیں گے ـــ مریض کو وہ دوا کھلا کر تجربہ کیا جائے گا ـــ اور بھی کئی طریقے اختیار کیے جائیں گے۔" پروفیسر نے بتایا۔

"بہت خوب ـــ لیکن یہ تجربہ کہاں کیا جائے گا ـــ"

"یہیں ـــ اسی جگہ ـــ ڈاکٹر ادریس کی اپنی ایک لیبارٹری ہے ـــ اس میں وہ بخوبی یہ تجربہ کر سکے گا۔"

"لیکن ہو سکتا ہے کہ جو دوائی ان جراثیموں کو ہلاک کر دے، وہ حامد کو بھی نقصان پہنچائے۔"

"یہ مقدار کا حساب ہے ـــ جو تجربہ کرنے کے بعد میں لگایا جائے گا ـــ" پروفیسر صاحب نے جواب دیا۔

"ہوں ـــ میں سمجھ گیا۔"

"اور پروفیسر صاحب عجیب بات تو یہ ہے کہ اس بیماری کے ایک دو کیس اور بھی ہو چکے ہیں۔" خان رحمان نے بتایا۔

"کیا!" پروفیسر داؤد حیران رہ گئے۔

"جی ہاں!"

"تو کیا یہ کوئی وبائی مرض ہے۔" پروفیسر نے سوچ میں ڈوبتے ہوئے کہا۔

"خدا جانے ـــ کیا بلا ہے ـــ ویسے اس سلسلے میں ایک سائیں بابا کا نام لیا جا رہا ہے۔" خان رحمان بولے۔

"کیا مطلب؟" پروفیسر داؤد نے حیران ہو کر پوچھا۔

"سنا ہے اس نے کسی لڑکے کو دیکھتے ہی دیکھتے ٹھیک کر دیا تھا۔"

"کیا بکواس ہے ـــ سائنس کے دور میں بھی لوگ ایسی باتیں کرتے ہیں۔"

"اسی لیے میں نے ان باتوں پر دھیان نہیں دیا۔"

اسی وقت ڈاکٹر ادریس اندر داخل ہوا۔

"مجھے افسوس ہے پروفیسر صاحب۔"

"کیا مطلب؟"

"اس کے خون میں کوئی خرابی نہیں ہے ـــ خون کے اپنے اجزاء کے علاوہ اس میں اور کسی قسم کے جراثیم نہیں ملے۔"

"کیا آپ نے پوری طرح تسلی کر لی ہے۔" پروفیسر نے حیران ہو کر پوچھا۔

"جی ہاں!"

"حیرت ہے ـــ تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ ہماری اس سلسلے میں مزید کوئی مدد نہیں کر سکتے۔"

"جی نہیں ـــ البتہ اگر جراثیم مل جاتے تو میں بہت کچھ کر سکتا

تھا۔"

"ٹھیک ہے۔۔میں جانتا ہوں۔۔اچھا ڈاکٹر تکلیف معاف۔"

وہ اُٹھ کھڑے ہوئے۔

ڈاکٹر ادریس انہیں دروازے تک چھوڑنے آیا۔ کار چلنے کے بعد پروفیسر کے منہ سے نکلا:

"حیرت ہے۔۔میرا خیال غلط نکلا۔۔یہ کیسے ممکن ہے۔۔"

۲

"اب کیا کیا جائے۔" انسپکٹر جمشید نے پوچھا۔

"بھئی فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔۔صبح دیکھیں گے کہ اس سلسلے میں کیا کیا جا سکتا ہے۔" پروفیسر داؤد بولے۔

"میری موٹر سائیکل اور آپ کی کار رحمان کے گھر کھڑی ہیں اس لیے جانا تو پہلے وہاں ہی پڑے گا۔۔"

"ٹھیک ہے۔"

وہ واپس پہنچے تو ظہور نے انسپکٹر جمشید سے کہا۔

"محمود کا فون آیا تھا۔۔آپ کے جاتے ہی۔"

"اچھا!"

"انہوں نے کہا تھا کہ آپ یہاں پہنچتے ہی فون کر لیں۔"

"کیوں۔۔خیر تو ہے۔"

"معلوم نہیں۔۔کیا بات ہے۔۔"

"اچھا۔۔میں فون کر کے معلوم کر لیتا ہوں۔"

انسپکٹر جمشید اندر آئے۔۔خان رحمان اور پروفیسر بھی ان کے ساتھ ہی چلے آئے تھے۔

"ہیلو۔۔کون۔۔بیگم شیرازی۔۔دیکھیے میں جمشید بول رہا ہوں جی ہاں۔۔ذرا محمود کو فون پر بُلا دیں۔۔۔۔ شکریہ!"

وہ انتظار کرنے لگے۔۔جلد ہی دوسری طرف سے محمود کی آواز آئی:

"ابا جان السلام علیکم۔"

"وعلیکم السلام۔۔محمود کیا بات تھی۔۔تم نے فون کیا تھا۔"

"جی ہاں۔۔فون تو آپ کا پتا کرنے کے لیے کیا تھا۔۔معلوم ہوا کہ حامد پر عجیب و غریب بیماری کا حملہ ہوا ہے۔۔حامد کو سائیں بابا کے پاس لے جائیں۔۔۔وہ اس بیماری کا فوراً علاج کر دیتا ہے۔"

"کیا تم نے یہی بات بتانے کے لیے۔ فون کرنے کو کہا تھا۔"

"جی ہاں۔"

"اس کے بارے میں ہم نے بھی سُنا ہے، لیکن بیٹا۔۔یہ دور بھلا کہیں جھاڑ پھونک کا ہے۔ اور پھر سُنی سنائی باتوں کا کیا اعتبار۔۔!"

"جی یہ سُنی سنائی نہیں ہے — آنکھوں دیکھی بات بیان کر رہا ہوں۔"

"کیا مطلب!"

"شام کے وقت ہم سیر کرنے کے لیے اکبر روڈ پر نکل گئے تھے — وہیں ہم نے سائیں بابا کو دیکھا — اسی وقت ایک کار میں دو نوجوان ایک لڑکے کو لے کر آئے — اس کے ہاتھ اور پیر مڑے ہوئے تھے۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے سائیں بابا نے اسے ٹھیک کر دیا۔"

"وہ کیسے؟"

"اس نے اسے ایک راکھ کی چٹکی کھلائی تھی — اور کچھ پڑھا تھا۔"

"کیا تم سچ کہہ رہے ہو۔"

"جی ہاں — بالکل — ہمارے سامنے لڑکا اپنے پیروں پر چلتا ہوا کار تک گیا تھا۔"

"اچھا ٹھیک ہے — میں جلد ہی گھر پہنچ رہا ہوں۔" انہوں نے ریسیور رکھ دیا — پھر ان سے بولے:

"لو بھئی — یہ سائیں بابا تو کوئی پہنچا ہوا آدمی لگتا ہے۔"

"پھر وہی سائیں بابا — لاحول ولاقوۃ —"

"لیکن اس مرتبہ بات سُنی سنائی نہیں رہی — بلکہ آنکھوں دیکھی ہے۔"

"کیا مطلب —"

"سائیں بابا نے محمود، فاروق اور فرزانہ کے سامنے ایک لڑکے کا علاج کیا — اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ بالکل ٹھیک ہو گیا۔"

"بالکل غلط — یہ کیسے ہو سکتا ہے — میں نہیں مانتا۔" پروفیسر بولے۔

"میں کب مانتا ہوں — لیکن محمود کا کہنا ہے کہ اس نے لڑکے کو ایک راکھ کی چٹکی کھلائی تھی اور کچھ پڑھ کر پھونکا تھا۔"

"ارے بھئی یہ بیسویں صدی ہے۔" پروفیسر ہنسے۔

"تو صبح اس سائیں بابا کو آزما کر دیکھ لینے میں کیا حرج ہے۔" خان رحمان کچھ حیران ہو چلے تھے۔

"ہرگز نہیں — میں ایسی باتوں کو نہیں مانتا۔"

"تو اس میں حرج ہی کیا ہے — ہمارا وہاں جانے میں نقصان ہی کیا ہے۔"

"جیسے تمہاری مرضی — لیکن میں تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گا —"

"اچھا — ہم آپ کو فون کر دیں گے کہ کیا بنا۔"

چاکلیٹ

اگلے دن اتوار تھا۔ انسپکٹر جمشید تینوں بچوں کو لے کر صبح سویرے ہی خان رحمان کے گھر پہنچ گئے۔ خان رحمان اور ان کے بیوی بچے ناشتے سے فارغ ہو چکے تھے لیکن ابھی ناشتے کی میز پر ہی بیٹھے تھے۔

"اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تم اتنے سویرے آجاؤ گے تو ہم ناشتا تمہارے ساتھ ہی کرتے۔"

"لیکن ہم تو ناشتا کر کے آئے ہیں۔" انسپکٹر جمشید نے کہا۔

"اچھا — چلو چھٹی ہوئی۔"

"انکل — حامد کا کیا حال ہے۔"

"ابھی وہی حال ہے بچو — جاؤ اندر جا کر اس سے مل لو —" خان رحمان نے کہا۔

نازو اور سرور نے ان تینوں کو ساتھ لیا اور حامد کے کمرے کی طرف چل پڑے:

"یہ حامد کہیں ڈھونگ تو نہیں رچا رہا ہے۔" فاروق نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

"میں تمہاری آواز سن رہا ہوں۔" حامد بول اٹھا۔

"اچھا — میں سمجھا تھا شاید ہاتھ اور پاؤں مڑنے کے ساتھ تمہارے کان بھی بند ہو گئے ہیں۔" فاروق مسکرایا۔

"ویسے فاروق کچھ ٹھیک ہی کہتا ہے۔" فرزانہ بولی۔

"کیا مطلب۔" حامد چونکا۔

"اس طرح ہاتھ اور پاؤں موڑ کر لیٹ جانا کچھ ایسا مشکل بھی نہیں — کہو تو میں ابھی کر کے دکھا سکتی ہوں۔"

"اڑا لو مذاق — ٹھیک ہونے پر تم سے سمجھوں گا۔" حامد نے جل کر کہا۔

"حساب کے سوال —" فاروق بول اٹھا۔

"حامد — اس سے حساب کے نہیں الجبرے کے سوال سمجھنا۔" محمود نے کہا۔

"وہ کیوں؟" نازو اور سرور نے حیران ہو کر کہا۔

"اس لیے کہ الجبرے کے نام سے ہی اس کی جان جاتی ہے۔" محمود نے بتایا۔

"بس، صرف الجبرے میں ہی تم دونوں سے کمزور ہوں — اور کسی بھی مضمون میں مجھ سے مقابلہ کر لو۔" فرزانہ بولی۔

"حامد! تمہیں معلوم ہے — اب تمہیں کہاں لے جایا جائے گا۔"

"نہیں تو — کیا مجھے اب پھر کہیں لے جانے کا پروگرام ہے۔"

"ہاں! اسی لیے تو آئے ہیں۔"

"کہاں جانا ہے۔"

"ایک ہیں ۔۔۔ سائیں بابا۔"

"سائیں بابا ۔۔۔" حامد نے حیران ہو کر کہا۔

اسی وقت خان رحمان اور انسپکٹر جمشید اندر داخل ہوئے:

"اگر تمہاری باتیں ختم ہو گئی ہیں تو چلیں ۔۔۔ یا پھر آج تمام دن باتیں ہی کرنے کا پروگرام ہے۔" خان رحمان نے پوچھا۔

"جی نہیں ۔۔۔ ہمارا ایسا کوئی پروگرام نہیں ہے۔"

"تو پھر چلو ۔۔۔ چلتے ہیں ۔۔۔"

"کیا ہم سب چل رہے ہیں۔" محمود نے پوچھا۔

"نہیں ۔۔۔ سرور اور ناز یہیں رہیں گے ۔۔۔" خان رحمان بولے

"وہ کیوں ابو۔" ناز نے ٹھنک کر پوچھا۔

"بیٹی، مریض تو ایک ہے اور اسے لے کر جائیں اتنے آدمی۔"

"تو پھر محمود، فاروق اور فرزانہ کو بھی یہاں چھوڑ جائیں۔" سرور نے کہا۔

"تم نہیں سمجھتے ۔۔۔ سائیں بابا کے پاس تو ہمیں یہی تینوں لے کر جا رہے ہیں ۔۔۔ ہمیں تو معلوم ہی نہیں وہ کہاں بیٹھتا ہے۔"

"اچھا خیر ۔۔۔ لیکن واپسی پر ان تینوں کو بھی ساتھ ہی لے آئیے گا۔"

"اچھا ۔۔۔ یہ بات منظور ہے۔"

سب گھر سے باہر نکلے ۔۔۔ حامد کو ظہور نے کندھے پر اٹھایا ہوا تھا۔

"میں ساتھ چلوں سرکار۔" ظہور نے پوچھا۔

"نہیں ۔۔۔ تمہاری ضرورت نہیں۔"

خان رحمان کار چلانے لگے۔ انہوں نے کچھ دیر بعد پوچھا۔

"کیا تم نے اپنی آنکھوں سے اس لڑکے کو ٹھیک ہوتے دیکھا تھا۔"

"جی ہاں۔" محمود بولا۔

"انہوں نے سائیں بابا کو کچھ دیا بھی تھا۔"

"جی ہاں ۔۔۔ سو سو روپے کے کچھ نوٹ تھے ۔۔۔ یہ نہیں معلوم کتنے تھے۔"

"کیا ۔۔۔!" انسپکٹر جمشید اور خان رحمان نے حیرت سے کہا

"جی ہاں ۔۔۔"

"حیرت ہے ۔۔۔ کیا سائیں بابا نے خود کہا تھا کہ اتنے روپے دو۔"

"جی نہیں ۔۔۔ وہ تو لینے سے انکار کرتا رہا تھا۔"

"اور پھر بھی انہوں نے دے دیے اور اس نے لے لیے۔" انسپکٹر جمشید نے پوچھا۔

"جی ہاں!"

"مجھے تو کوئی چکر معلوم ہوتا ہے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"جی کیا مطلب۔"

"سائیں بابا کوئی فراڈ تو نہیں۔ اس طرح تو یہ سینکڑوں روپے روز کما سکتا ہے۔"

"لیکن راکھ کی چٹکی سے لڑکا ٹھیک کیسے ہو گیا۔" محمود نے اعتراض کیا۔

"یہی بات تو اُلجھن میں ڈالنے والی ہے۔"

جنگل کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا — سیاہ سڑک صبح کی خوشگوار دھوپ میں چمک رہی تھی۔

"بس — یہیں ایک طرف کر کے روک لیں — وہ رہا خیمہ۔" فاروق نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"ارے — یہاں تو بہت بھیڑ ہے۔" خان رحمان کے منہ سے نکلا۔

"ہاں — معلوم ہوتا ہے — بابا کافی مشہور آدمی ہے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

خان رحمان نے حامد کو اپنے کندھے پر اٹھایا اور خیمے کی طرف چل پڑے۔ کئی ضرورت مند سائیں بابا کے آگے ہاتھ جوڑے بیٹھے تھے — کچھ کھڑے تھے۔ ایک شخص سائیں بابا کی ٹانگیں دبا رہا تھا۔ اس

کی آنکھیں بند تھیں — وہ خیمے کے دروازے پر پہنچ کر کئی سیکنڈ تک کھڑے سائیں بابا اور اُس کے عقیدت مندوں کا جائزہ لیتے رہے — لیکن ان کی طرف کسی نے کوئی توجہ نہ دی آخر خان رحمان نے کھنکار کر کہا۔

"سائیں بابا — کچھ ضرورت مند آپ کے دروازے پر کھڑے ہیں۔"

"ہمیں معلوم ہے — ہم دل کی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں — تم اپنے بچے کے لیے یہاں آئے ہو نا —" سائیں بابا نے بدستور آنکھیں بند کیے جواب دیا۔

"جی ہاں۔" خان رحمان اور انسپکٹر جمشید بھی چند لمحے کے لیے حیران رہ گئے۔ عقیدت مندوں کی آنکھیں تو حیرت سے پھیل گئی تھیں۔

وہ تینوں بھی کچھ کم حیران نہ تھے۔

"کیا اسے بھی وہی ہاتھوں اور پیروں والی بیماری لگ گئی ہے — کیوں ٹھیک ہے نا۔" سائیں بابا کی آنکھیں اب بھی بند تھیں۔ انسپکٹر جمشید جس وقت دروازے پر پہنچے تھے اسی وقت سے بغور سائیں بابا کی طرف دیکھتے رہے تھے — اس کا سر بھی نیچے جھکا ہوا تھا اس لیے یہ بھی نہیں سوچا جا سکتا تھا کہ اس نے پلکوں کی درز میں سے انہیں دیکھ لیا ہو گا۔"

"جی ہاں!"

"تو آگے لے آؤ — وہاں کیوں کھڑے ہو۔ لٹا دو اسے میرے سامنے ... اور پھر دیکھو قدرت کی کاریگری۔"

خان رحمان نے حامد کو اس کے آگے لٹا دیا — انسپکٹر جمشید اور تینوں بچے بھی آگے بڑھ آئے۔ سائیں بابا نے راکھ کی ڈبیا اٹھائی، اس میں سے چٹکی میں راکھ لی اور حامد کو منہ کھولنے کا اشارہ کیا — اس کے منہ کھولتے ہی اس نے راکھ حامد کے منہ میں ڈال دی — پھر مٹی کے پیالے میں پانی لے کر اسے پلایا اور منہ ہی منہ میں کچھ پڑھنے لگا — عجیب و غریب زبان تھی جس کا ایک لفظ بھی اُن کے پلے نہ پڑا۔

"چلو بیٹا — اب اپنے پاؤں پر اُٹھ کر کھڑے ہو جاؤ۔" سائیں بابا نے پڑھائی ختم کر کے کہا۔

حامد نے اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی کوشش کی — دوسرے ہی لمحے ان کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ حامد سیدھا کھڑا ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

"اب اپنے ہاتھوں کو جھٹکا دو —" سائیں بابا نے کہا۔

حامد نے ہاتھوں کو جھٹکا — وہ بھی فوراً سیدھے ہو گئے۔

"ہم آپ کی خدمت میں کیا پیش کریں بابا۔" خان رحمان نے خوش ہو کر کہا۔

"کچھ بھی نہیں — فقیروں کو کسی چیز کی ضرورت نہیں ہوتی۔"

"پھر بھی —"

"بس جاؤ — جا کر غریبوں کو کھانا کھلا دینا —"

"جی اچھا —" خان رحمان نے انسپکٹر جمشید کا اشارہ سمجھتے ہوئے کہا — انہوں نے چلنے کا اشارہ کیا تھا۔

واپسی پر انسپکٹر جمشید خاموش خاموش تھے — انہیں خاموش دیکھ کر محمود سے رہا نہ گیا۔

"کیا بات ہے ابا جان۔"

"کچھ نہیں، مجھے یہ سب کچھ عجیب سا لگ رہا ہے — ڈاکٹروں کی کوئی دوائی کارگر نہیں ہو سکی — اور اس کی ایک چٹکی کام کر گئی — سائنس کے دور میں یہ بہت عجیب بات نہیں ہے۔"

"ہے تو عجیب بات ہی — لیکن کچھ لوگ واقعی پہنچے ہوئے بھی تو ہوتے ہیں — اور پھر کمال تو یہ ہے کہ اس نے ہم سے کچھ مانگا بھی نہیں — محمود وغیرہ کا کہنا بھی یہی ہے کہ کل بھی اس نے اپنے منہ سے کچھ نہیں مانگا تھا —" خان رحمان نے کہا۔

"لیکن کئی سو روپے لے ضرور لیے تھے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"ہاں — لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے — میں تو یہ جانتا ہوں کہ حامد ٹھیک ہو گیا ہے۔"

"اور اب میری یہ نصیحت چاروں بچے کان کھول کر سن لیں

۔۔۔آج کے بعد تم بازار کی کوئی چیز نہیں کھاؤ گے ۔۔۔ ناز اور سرور کو بھی کہہ دینا۔"

"کیوں ۔۔۔ آپ ایسا کیوں کہہ رہے ہیں۔"

"بس کسی وجہ سے کہہ رہا ہوں ۔۔۔ حامد کیا تمہیں یاد ہے ۔۔۔ کل تم نے گھر سے باہر اور کیا کیا کھایا تھا۔" انہوں نے پوچھا۔

"جی ۔۔۔ صرف چاکلیٹ کھائے تھے۔"

"سرور اور ناز نے بھی ۔۔۔"

"جی ہاں ۔۔۔ انہوں نے بھی کھائے تھے۔"

"بس ٹھیک ہے ۔۔۔ خاص طور پر تم لوگ چاکلیٹ ہرگز نہ کھانا۔"

"لیکن کیوں ۔۔۔"

"ہو سکتا ہے ان چاکلیٹوں میں ہی کوئی گڑبڑ ہو۔"

"اگر ایسا ہوتا تو سرور اور ناز کو کیوں کچھ نہیں ہوا۔"

"یہی سوال مجھے چکرا رہا ہے۔"

"وہم ہے تمہارا ۔۔۔ یہ ضرور کوئی بیماری ہے۔"

"اگر یہ کوئی بیماری ہے ۔۔۔ تو ڈاکٹر کیوں اس سے لاعلم ہیں۔ ان کے پاس اس بیماری کا علاج کیوں نہیں ہے۔"

"ہو سکتا ہے کہ یہ کوئی بالکل نئی بیماری ہو۔"

"ہاں ۔۔۔ تم یہ کہہ سکتے ہو ۔۔۔ مگر میں نہیں ۔۔۔"

"کیوں ۔۔۔"

"اس کا جواب آئندہ چند دنوں تک تمہیں دے سکوں گا۔" انسپکٹر جمشید نے کہا اور خاموش ہو گئے۔

۸

اگلے دن اخبار کی ایک سرخی نے پورے شہر میں سنسنی پھیلا دی ۔۔۔ لوگ خوف زدہ ہو گئے ۔۔۔ سرخی تھی:

"شہر کے سات بچوں پر عجیب و غریب بیماری کا حملہ"

سرخی کے نیچے بیماری کا شکار ہونے والے بچوں کے نام اور پتے بھی دیے گئے تھے اور یہ بھی تحریر تھا کہ شہر بھر کے ڈاکٹر اس بیماری کا علاج دریافت کرنے کے لیے کوشش کر رہے ہیں ۔۔۔ اور یہ کہ ابھی تک ساتوں بچے صحت یاب نہیں ہو سکے۔ آخر میں لکھا تھا کہ اس بیماری کے علاج کے سلسلے میں اکبر روڈ کے جنگل میں بیٹھنے والے ایک سائیں بابا کا نام لیا جا رہا ہے۔ سنا گیا ہے کہ اس نے دو تین بچوں کا کامیاب علاج کیا ہے۔

اس خبر نے شہر میں آگ سی لگا دی ۔۔۔ محمود، فاروق اور فرزانہ نے ناشتے کی میز پر یہ خبر پڑھی۔

"ارے! اس میں تو ایک بچہ ہمارے پڑوس کا بھی ہے۔"

فرزانہ چونکی۔

"کون سا ___"

"یہ تیمور بابر ___ شریف الدین کا لڑکا ہے ___ اسی گلی کے دوسرے سرے پر تو مکان ہے۔"

"اچھا ___ تو ہم چلیں گے ___" محمود بولا۔

"اس سے یہ ضرور پوچھنا ___ کہ اس نے کیا کھایا تھا۔" انسپکٹر جمشید نے کہا۔

"جی اچھا۔"

ناشتے سے فارغ ہو کر وہ سکول کے لیے روانہ ہو گئے۔ راستے میں کچھ دیر کے لیے تیمور بابر کو دیکھنے اس کے گھر بھی گئے۔ تیمور بابر کے ارد گرد کافی بھیڑ تھی ___ وہ ان تینوں کو پہچانتا تھا ___ انہیں دیکھ کر مسکرایا۔

"کیا حال ہے تیمور۔" محمود نے پوچھا۔

"بس دیکھ لو ___"

"تم نے کل کیا کھایا تھا ___" فاروق نے پوچھا۔

"میں نے گھر میں کھانا کھانے کے علاوہ گھر سے باہر چاکلیٹ کھایا تھا۔"

"کیا!" ان تینوں کے منہ سے نکلا۔

پھر انہوں نے اُس کے والد کو اسے سائیں بابا کے پاس لے جانے کا مشورہ دیا اور باہر نکل آئے:

"عجیب بات ہے ___ اس نے بھی چاکلیٹ کھایا تھا۔" محمود نے کہا۔

"اس میں عجیب بات کیا ہے؟" فاروق نے پوچھا۔

"ہے کیوں نہیں ___ حامد نے بھی چاکلیٹ کھایا تھا۔" فرزانہ نے تنک کر کہا۔

"لیکن ___ سرور اور ناز نے بھی چاکلیٹ کھائے تھے۔" فاروق نے تیز لہجے میں کہا۔

"اس بات پر تو ابا جان بھی حیران ہیں۔" فرزانہ بولی۔

"خیر ___ سکول نزدیک آ گیا ہے ___ پہلے سکول سے فارغ ہو لیں ___ اس موضوع پر پھر سوچیں گے۔" فاروق نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔" فرزانہ نے اس کی تائید کی۔

اچانک محمود سکول میں داخل ہونے کی بجائے جنرل مرچنٹ کی ایک دکان میں داخل ہو گیا ___ دوسرے ہی لمحے ان دونوں کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں اور منہ کھُل گئے۔

محمود چاکلیٹ خرید رہا تھا۔

پری اور جل پری

انسپکٹر جمشید اپنے دفتر میں بیٹھے کچھ فائلوں کا جائزہ لے رہے تھے کہ سب انسپکٹر اکرام اندر داخل ہوا:

"یہ بیماری تو روز بروز زور پکڑتی جا رہی ہے۔" وہ آتے ہی بولا۔

"ہاں ___ سمجھ میں نہیں آتا ___ کیا ماجرا ہے۔" وہ بولے۔

"ڈاکٹر صاحبان بھی چکر میں ہیں۔"

"خیر ___ ہمیں اس سے کیا ___ ہمارے محکمے کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔" انسپکٹر جمشید نے جھوٹ موٹ کی لاپروائی کا اظہار کیا۔

"لیکن اگر یہ کوئی بیماری نہ ہوئی تب ___ تب تو تعلق نکل آئے گا نا۔"

"کیا مطلب؟" انسپکٹر جمشید چونکے ___ دراصل اس بیماری کے بارے میں وہ اپنے خیالات اپنے تک ہی محدود رکھنا چاہتے تھے۔

"ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ اس قسم کی کسی بیماری کا وجود نہیں ہے۔"

"تو نئی بیماری پیدا ہو گئی ہو گی۔"

"تو پھر اس کا کوئی علاج بھی دریافت ہو جانا چاہیے۔"

"بھئی ڈاکٹر کوشش کر تو رہے ہیں ___ کوئی علاج بھی ڈھونڈ ہی لیں گے۔"

"نہ جانے مجھے کیوں یہ احساس ہو رہا ہے کہ یہ سب کچھ مصنوعی ہے۔"

"ہوں ___ تو تم بھی یہی سمجھ رہے ہو ___"

"کیا مطلب ___ کیا آپ بھی اسی نتیجے پر پہنچے ہیں ___"

"ہاں ___ اور سنو ___ آج تمہیں ایک کام کرنا ہے۔"

"جی فرمائیے!"

"آج اخبار میں جن چھ سات بچوں کے بیمار ہونے کی خبر چھپی ہے تم ان سے ملو ___ صرف تیمور بابر سے نہ ملنا۔"

"کیوں ___ اس سے کیوں نہیں۔" اکرام نے پوچھا۔

"اس سے محمود اور فاروق مل چکے ہوں گے ___ ہاں تو بقیہ چھ سے تم اسی وقت جا کر باری باری ملو ___"

"مجھے کیا کرنا ہو گا ___"

"تمہیں ان سب سے صرف ایک بات پوچھنی ہو گی۔"

"صرف ایک بات؟" اکرام نے حیران ہو کر کہا۔

"ہاں ___ انہوں نے کل تمام دن کیا کیا چیزیں کھائی تھیں۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب پھر بتاؤں گا — تم اسی وقت روانہ ہو جاؤ۔"

"جی بہتر!"

اکرام کمرے سے نکل گیا — اسی وقت فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف پروفیسر داؤد تھے۔

"تم نے کل فون نہیں کیا۔" انہوں نے پوچھا۔

"اوہ — میں اس خیال میں رہا کہ خان رحمان نے فون کر دیا ہوگا۔"

"نہیں — اس نالائق نے بھی نہیں کیا — وہ اس خیال میں رہا کہ تم نے مجھے فون کر دیا ہوگا۔" انہوں نے بتایا۔

"اوہ! یہ لطیفہ بھی خوب رہا۔"

"ہاں تو اس سائیں نے حامد کا علاج کر دیا۔"

"ہاں — یہ بات تو تسلیم کرتے ہی بن پڑے گی۔"

"تم نے اس راکھ کو دیکھا تھا — کیا وہ راکھ ہی تھی۔" پروفیسر داؤد نے پوچھا۔

"میں یقین سے نہیں کہہ سکتا — ویسے اس کا رنگ بالکل راکھ جیسا ہی تھا۔"

"اور آج سات بچے بیمار ہو گئے ہیں — کیا وہ ساتوں کے ساتوں اس کے پاس نہیں جائیں گے۔"

"خیال تو یہی ہے کہ ضرور جائیں گے — کیونکہ اس وقت تک سائیں بابا کو بھی بہت شہرت مل چکی ہے۔"

"اندازہ لگاؤ — وہ ان سے کتنے پیسے کمالے گا۔"

"لیکن اس نے کل ہم سے تو کوئی پیسہ نہیں لیا تھا —"

"یہی سوال تو مجھے الجھن میں ڈال رہا ہے۔" پروفیسر داؤد بولے۔

"اور مجھے بھی — ویسے میرا ایک اندازہ ہے —"

"اور وہ کیا۔"

"یہ بیماری چاکلیٹ کھانے سے رونما ہوتی ہے۔"

"خان رحمان کے باقی دو بچوں نے بھی تو چاکلیٹ کھائے تھے۔" پروفیسر داؤد بولے۔

"یہ دوسرا الجھا دینے والا سوال ہے۔"

"گویا دو سوال ہو گئے۔" پروفیسر ہنسے۔

"ہو سکتا ہے کوئی تیسرا بھی پیدا ہو جائے —" انسپکٹر جمشید نے بھی ہنس کر کہا۔

"پھر کیا سوچا ہے تم نے —"

"سوچا کہاں ہے — سوچ رہا ہوں — آپ بھی سوچتے رہیں۔"

"اچھا۔"

دوسری طرف سے سلسلہ منقطع ہوگیا ۔۔۔ اسی وقت فون کی گھنٹی
پھر بجی ۔۔۔ دوسری طرف سے ڈی آئی جی کہہ رہے تھے۔
"جمشید میرے لڑکے پر بھی اسی بیماری کا حملہ ہوا ہے۔"
"کیا!" ان کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔
"ہاں ۔۔۔ فوراً میرے کمرے میں آ جاؤ ۔۔۔ ہم اسی وقت گھر
جائیں گے۔"
"جی بہتر۔"
وہ اپنے کمرے سے نکل کر ڈی آئی جی صاحب کے کمرے میں
پہنچے جو بے چینی سے ٹہل رہے تھے:
"چلو میرے ساتھ۔"
پندرہ منٹ بعد وہ مریض کے کمرے میں موجود تھے ۔۔۔ انسپکٹر
جمشید نے دیکھا کہ ڈی آئی جی کے لڑکے کی حالت بھی حامد سے مختلف
نہیں تھی
"بیٹا! تم نے کیا کھایا تھا۔" انسپکٹر جمشید نے پوچھا ۔۔۔ اس کی
والدہ اسے ابھی ابھی سکول سے لائی تھیں ۔۔۔ سکول سے فون پر
اطلاع دے دی گئی تھی۔
"جی میں نے صبح گھر میں ناشتا کیا تھا۔"
"اور اس کے بعد ۔۔۔ گھر سے باہر بھی کوئی چیز کھائی تھی۔"
"جی ہاں ۔۔۔ چاکلیٹ ۔۔۔"

انسپکٹر جمشید بھونچکا رہ گئے۔ پھر وہاں ڈاکٹروں کی آمد کا سلسلہ
شروع ہوا ۔۔۔ لیکن کئی گھنٹے تک کوشش کرنے کے بعد بھی ڈاکٹر
اس کا علاج نہ کر سکے۔
"سر! میری ایک ناچیز رائے ہے۔" انسپکٹر جمشید تنگ آکر
بولے۔
"ہاں کہو۔"
"اسے سائیں بابا کے پاس لے چلتے ہیں۔"
"کیا فضول بات کرتے ہو۔"
"لیکن سر ۔۔۔ کل بھی میں ایک دوست کے بچے کو لے کر جا
چکا ہوں ۔۔۔ اس نے دیکھتے ہی دیکھتے بچے کو ٹھیک کر دیا تھا۔"
"کیا ۔۔۔؟" ڈی آئی جی حیران رہ گئے۔
"ہاں ۔۔۔ یہ بالکل سچ ہے ۔۔۔ خان رحمان کا لڑکا بھی شکار ہو
چکا تھا۔"
"لیکن ۔۔۔ ذرا سوچو ۔۔۔ میں وہاں جاؤں گا ۔۔۔ اس سائیں کے
پاس۔" ڈی آئی جی نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔
"آپ نہ جائیں ۔۔۔ اپنے بڑے لڑکے کو بھیج دیں ۔۔۔ یا میں چلا
جاتا ہوں۔"
"اچھا جیسے تمہاری مرضی۔"
انسپکٹر جمشید واپس اپنے دفتر پہنچے تو اکرام ان کا منتظر تھا۔

"کہو—کیا رہا—"

"آپ کہاں چلے گئے تھے—" اس نے جواب دینے کی بجائے الٹا سوال کر ڈالا۔

"ڈی آئی جی صاحب کے لڑکے پر بھی بیماری کا حملہ ہو گیا تھا۔"

"کیا!" اکرام چلّایا۔

"ہاں—اب وہ ٹھیک ہے—اسے بھی سائیں بابا کے پاس لے جانا پڑا—اور جانتے ہو—اس نے اس بار بھی مجھ سے کچھ نہیں لیا۔"

"حیرت ہے—کیا کچھ اور لوگ بھی وہاں پہنچے ہوئے تھے—"

"ہاں—میں جب وہاں سے چلا ہوں، اس وقت ایک کار میں ایک لڑکے کو لایا گیا تھا—"

"وہاں تو میلہ لگا ہو گا۔"

"بس جنگل میں منگل ہو رہا ہے—تم نے بتایا نہیں—کیا معلوم کرکے آ رہے ہو—"

ان سب نے ایک مشترکہ چیز کھائی تھی۔" اکرام نے بات درمیان میں چھوڑ دی—

"چاکلیٹ—کیوں یہی کہنا چاہتے ہو نا۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"آپ کو کیسے معلوم ہوا۔" اکرام نے حیرت سے آنکھیں پھاڑتے ہوئے کہا۔

۶

"تم نے اب تک نہیں بتایا کہ یہ چاکلیٹ کیوں خریدے ہیں۔" فاروق نے کوئی دسویں مرتبہ سوال کیا۔ اس وقت وہ سکول سے لوٹ رہے تھے۔

"کیا تمہیں یاد نہیں رہا—کہ ابا جان نے بازار سے کوئی چیز کھانے سے منع کر رکھا ہے اور خاص طور پر چاکلیٹ کھانے سے۔"

"ہاں—مجھے یاد ہے۔"

"اور پھر بھی تم نے چاکلیٹ خرید لیے۔" فاروق نے حیران ہو کر کہا۔

"میں انہیں کھاؤں گا نہیں—بے فکر رہو۔" محمود نے بتایا۔

"تو کیا چاٹو گے—لیکن چاٹنے سے بھی وہی نتیجہ نکلنے کا امکان ہے۔" فاروق مسکرایا۔

"میں انہیں چاٹوں گا بھی نہیں۔"

"اوہ—میں سمجھ گیا۔" فاروق نے چونک کر کہا۔

"کیا سمجھ گئے—"

"تم انہیں اپنے سامنے رکھ کر ان کی پوجا کرو گے۔" فاروق نے ہنس کر کہا۔

"لال پیلے کیوں ہو رہے ہو—بتا دوں گا گھر چل کے۔"

"نہیں تو .... میں لال پیلا نیلا ویلا تو نہیں ہو رہا ہوں" فاروق نے حیرت کا اظہار کیا۔

"ہاں — یہ تو سبز ہو رہے ہیں۔" فرزانہ ہنسی۔

"تمہارے بھی پر نکل آئے۔" فاروق نے غصے سے کہا۔

"اچھا — پھر تو میں پری بن گئی۔" فرزانہ خوش ہو کر بولی۔

"مجھے پریوں کا علاج آتا ہے۔" فاروق نے کہا۔

"وہ کیا؟" محمود نے پوچھا۔

"پانی میں دھکا دوں گا ابھی اسے — سارے پر بھیگ جائیں گے۔" فاروق نے جلے کٹے لہجے میں کہا۔

"تو کیا ہوا — میں جل پری بن جاؤں گی۔"

"بڑا شوق ہے تمہیں پری اور جل پری بننے کا —"

"مجھے تو نہیں — یہ تو تمہیں زبردستی بنا رہے ہو۔" فرزانہ نے معصومانہ انداز میں کہا۔

"بڑی تیزی سے چل رہی زبان۔"

"اگر تمہیں برا لگ رہا ہے تو میں اب اسے آہستہ چلاؤں گی اور تم کہو گے تو بالکل ہی نہیں چلاؤں گی۔"

"شکریہ! مجھے کیا پڑی ہے — جتنا جی چاہے چلاؤ — خود ہی ایک دن چل چل کر گھس جائے گی۔" فاروق نے بھی خوش دلی سے کہا۔

"شکر ہے — تمہارا موڈ تو درست ہوا — ورنہ میں تو سمجھ

رہی تھی کہ آج شاید سارے دن انگارے ہی چباتے رہو گے۔"

"ابھی اتنی سردی نہیں ہوئی — یوں بھی انگارے چبانے کا کام تم مجھ سے بہتر کر سکتی ہو۔"

"قدر دانی کا شکریہ —" فرزانہ مسکرائی۔

"ارے! ہم تو بہت دور نکل آئے۔" فاروق نے چونک کر کہا۔

"نہیں تو — ہم تو گھر کے بہت نزدیک آ گئے ہیں۔" فرزانہ نے حیران ہو کر کہا — وہ فاروق کے جملے کا مطلب نہیں سمجھ سکی تھی۔

"میرا مطلب ہے، ہم دونوں تو محمود سے چاکلیٹ خریدنے کی وجہ پوچھ رہے تھے۔ باتوں باتوں میں کہاں سے کہاں نکل گئے۔"

"ہاں! پریوں اور جل پریوں تک تو پہنچ ہی گئے ہیں — اگر تھوڑی دیر تمہیں اور خیال نہ آتا تو ضرور جنوں اور دیووں کے دیس تک پہنچ جاتے — کیا کہتے ہیں ان کے دیس کو۔" محمود بول اٹھا۔

"کوہ قاف۔" فرزانہ نے جواب دیا۔

"اوہاں یاد آیا — دراصل جب میں بہت چھوٹا تھا، اس وقت جنوں اور دیووں کی کہانیاں پڑھا کرتا تھا — اب تو ان پر ہنسی آتی ہے — کیا کہانیاں ہوتی تھیں وہ بھی —" محمود نے کہا۔

"عجیب اوٹ پٹانگ ۔۔۔" فرزانہ بولی۔

"اس اوٹ پٹانگ سے یاد آیا ۔۔۔ وہی مرغے کی ایک ٹانگ۔" فاروق نے کہا۔

"کیا مطلب؟" محمود نے حیران ہو کر پوچھا۔

"یعنی تم نے ابھی تک نہیں بتایا ۔۔۔"

"بس اب گھر پہنچ کر بتاؤں گا۔"

"آخر تم کیا کرنا چاہتے ہو ۔۔۔ ان چاکلیٹوں کا۔"

"میں ان سے ایک تجربہ کرنا چاہتا ہوں۔"

"کیا!" دونوں کے منہ حیرت سے کھلے کے کھلے رہ گئے۔

تجربہ

"بھئی اکرام ۔۔۔ مجھ سے ایک غلطی ہو گئی۔" انسپکٹر جمشید نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"وہ کیا؟"

"میں نے تمہیں ان ساتوں بچوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے تو بھیج دیا ۔۔۔ اور تم یہ بھی معلوم کر آئے کہ ان سب نے چاکلیٹ کھائے تھے لیکن جو بات معلوم کرنی چاہیے تھی، اس کا خیال مجھے رہا نہ تمہیں۔"

"میں اب بھی نہیں سمجھا ۔۔۔ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔"

"کیا تم نے یہ بھی معلوم کیا ۔۔۔ کہ یہ چاکلیٹ کس کمپنی کے تھے۔ ایک ہی کمپنی کے چاکلیٹ استعمال کیے گئے یا مختلف کمپنیوں کے۔"

"اوہ واقعی ۔۔۔ اس طرف تو میرا دھیان بھی نہیں گیا حالانکہ سب سے ضروری بات یہی تھی۔"

"اور اس کے بغیر تفتیش کی گاڑی ٹھپ ہو کر رہ گئی ہے۔ اس گاڑی کو آگے چلانے کا ایک یہی راستہ ہے کہ تم ایک بار پھر

اُن بچوں کے پاس جاؤ ــــ اگر کسی بچے کے پاس کوئی چاکلیٹ بچا ہوا ہو تو وہ بھی لے آنا۔"

"جی اچھا ــــ میں ابھی جاتا ہوں۔"

"اور ذرا جلدی واپس آنے کی کوشش کرنا ــــ"

"ایک بات پوچھوں سر!"

"ہاں پوچھو ــــ کیا بات ہے۔"

"آخر اس بیماری سے ہمارے محکمے کا کیا تعلق ہے ــــ"

"تعلق تو کچھ بھی نہیں ہے۔"

"پھر ــــ آپ کیوں اس قدر دلچسپی لے رہے ہیں۔"

"میں حیران ہوں ــــ یہ کیسی بیماری ہے، جس کا علاج شہر کا بڑے سے بڑا ڈاکٹر بھی نہیں کر سکا ــــ اور اس بیماری کا ہر مریض پہلے چاکلیٹ ضرور استعمال کرتا ہے ــــ آخر چاکلیٹ کا اس بیماری سے کیا تعلق ہے ــــ کہیں ایسا تو نہیں کہ آج کل شہر کی فضا میں کوئی نئی قسم کے جراثیم پنپ رہے ہیں اور چاکلیٹ کے شوقین ہیں ــــ جونہی کوئی بچہ چاکلیٹ کھانے لگتا ہے جراثیم اس کے کھانے سے پہلے اس چاکلیٹ سے چمٹ جاتے ہیں ــــ اور بچہ بیمار پڑ جاتا ہے۔"

"آپ کی بات تو دل کو لگتی ہے ــــ لیکن کیا ایسا ہو بھی سکتا ہے۔"

"نہیں ــــ میں کب کہتا ہوں ــــ میں نے تو صرف ایک خیال ظاہر کیا تھا۔"

"اور ان بچوں کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے ــــ جنہوں نے چاکلیٹ کھائے اور پھر بھی بیماری کا شکار نہیں ہوئے۔"

"جراثیم چاکلیٹ کی طرف لپکے لیکن اس سے پہلے کہ وہ اس سے چمٹ سکتے، بچے نے چاکلیٹ منہ میں ڈال لیا ــــ کیوں کیا خیال ہے ــــ اس طرح کچھ بچے بیمار ہونے سے بال بال بچ گئے۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"آپ کا خیال بہت عجیب ہے ــــ"

"ابھی یہ محض خیال ہی ہے ــــ ویسے میں پروفیسر داؤد سے اس نظریے پر بات کر لیتا ہوں ــــ اتنی دیر میں تم چاکلیٹوں کے بارے میں معلوم کر آؤ۔"

"جی اچھا۔"

اکرام کے نکلتے ہی انہوں نے پروفیسر داؤد کو فون کیا۔ جلد ہی دوسری طرف سے پروفیسر داؤد کی آواز سنائی دی۔ انسپکٹر جمشید نے اپنا جراثیم والا نظریہ انہیں بتایا ــــ پروفیسر سن کر بے تحاشہ ہنسنے لگے:

"یہ کیسے ہو سکتا ہے ــــ"

"لیکن آپ نے بھی تو جراثیم کا ہی خیال ظاہر کیا تھا۔" انسپکٹر جمشید

نے بھی ہنس کر کہا۔

"وہ اور بات تھی — لیکن تمہارا یہ سوچنا کہ جراثیم آکر چاکلیٹ کو چمٹ جاتے ہیں، ایک دم غلط ہے۔"

"شکریہ یہ میرا مقصد حل ہو گیا۔"

"کیا مطلب!" پروفیسر داؤد چونکے۔

"جی کچھ نہیں — پھر بتاؤں گا کہ اس بات کے معلوم کرنے سے میرا کیا مطلب تھا —"

"اچھا خیر — اور کچھ۔"

"جی نہیں — شکریہ!"

تقریباً دو گھنٹے بعد سب انسپکٹر اکرام کی واپسی ہوئی۔

"کیوں — کچھ معلوم ہوا۔"

"جی ہاں — تمام لڑکوں نے ایک ہی کمپنی کے چاکلیٹ کھائے تھے۔"

"کیا مطلب؟" انسپکٹر جمشید چونکے۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے۔"

"یہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ ہمارے ہاں صرف ایک ہی کمپنی چاکلیٹ تیار کرتی ہے "ڈیلینٹ سوئیٹس"۔ اس کے علاوہ باہر سے جو چاکلیٹ آتے ہیں، وہ ان کے مقابلے میں گھٹیا ہوتے ہیں اس لیے عام طور پر یہی پسند کیے جاتے ہیں۔"

"تب تو ہمارا کام آسان ہو گیا۔"

"جی — کیا مطلب۔" اس مرتبہ اکرام چونکا۔

"مطلب یہ کہ ہمیں دو تین فیکٹریوں کی بجائے صرف ایک فیکٹری میں ہی چھان بین کرنی ہو گی۔"

"لیکن اس کی ضرورت ہی کیا ہے — ہمارا اس سے کیا تعلق۔"

"تعلق ہے — مگر تم ابھی اس تعلق کو نہیں سمجھ سکتے — ہم اسی وقت ڈیلینٹ سوئیٹس فیکٹری چل رہے ہیں۔"

یہ کہتے ہی انسپکٹر جمشید اٹھ کھڑے ہوئے — اکرام انہیں عجیب سی نظروں سے گھور رہا تھا۔

۱۰

تینوں گھر پہنچے — ابھی انسپکٹر جمشید نہیں لوٹے تھے ان کے آنے میں کافی دیر تھی — تینوں سیدھے اپنے کمرے میں آئے — یہ وہی کمرہ تھا، جس کی ایک کھڑکی پائیں باغ میں کھلتی تھی۔ اس کمرے کو وہ اپنی تجربہ گاہ بھی کہا کرتے تھے۔

"میں ابا جان کے آنے سے پہلے پہلے تجربہ مکمل کر لینا چاہتا ہوں۔"

"کیوں — اگر ابا جان آ گئے تو کیا وہ تمہیں تجربہ کرنے سے روک دیں گے۔" فرزانہ نے پوچھا۔

"یہ بات نہیں — بلکہ میں انہیں حیران کر دینا چاہتا ہوں۔"

"وہ کیسے — کہیں یہ چاکلیٹ تم خود کھانے کا ارادہ تو نہیں رکھتے
اگر یہی بات ہے تو تمہارے ہاتھ اور پاؤں مڑے دیکھ کر ابا جان
واقعی حیران ہوں گے۔" فاروق نے اس کا مذاق اڑایا۔
"میں اتنا بے وقوف نہیں۔"
"تو پھر — کتنے ہو —" فاروق بول اٹھا۔
"باتوں میں وقت ضائع نہ کرو۔"
"اچھا — جس میں تم کہتے ہو، اس میں ضائع کیے دیتا ہوں۔
بتاؤ۔" فاروق پر مذاق کا بھوت سوار تھا۔
"تم باز نہیں آؤ گے۔"
"چلو آ گیا — اب بتاؤ کیا کرنا چاہتے ہو۔"
"سب سے پہلے تم گھر میں سے پوسی کو پکڑ لاؤ۔"
"میں یہ کام نہیں کر سکتا۔"
"کیوں —"
"میں بلی باز نہیں ہوں۔"
"کیا مطلب؟" محمود نے حیران ہو کر پوچھا۔ فرزانہ فاروق کو
مسکرا کر دیکھ رہی تھی غالباً وہ سمجھ گئی تھی کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔
"کبوتر پکڑنے والے کو لوگ کبوتر باز کہتے ہیں — تو بلی پکڑنے والا
بلی باز ہوا — جب کہ میں بلی باز نہیں ہوں — اس لیے میں بلی پکڑ
کر نہیں لاؤں گا۔"

"بھئی فاروق باتوں میں بہت وقت ضائع کرتے ہو — خدا کے
لیے جاؤ —"
"مگر مجھے کیا معلوم وہ اس وقت کہاں ہو گی۔"
"شاید باورچی خانے میں ہو گی۔"
"اچھا سائنس دان صاحب — میں ابھی بلی کو کان سے پکڑ کر حاضر
کرتا ہوں۔" فاروق نے ادب سے جھکتے ہوئے کہا اور پھر سیدھا ہوتے
ہی کمرے سے نکل گیا۔
"اُلو کہیں کا — کان کھا جاتا ہے۔" محمود نے اس کے جاتے
ہی کہا۔
"کیا کہا — میں اُلو ہوں — میں کان کھا جاتا ہوں۔" فاروق
دروازے میں نمودار ہوا — در اصل وہ گیا نہیں تھا — دروازے
کے پاس کھڑا ہو گیا تھا۔
"اگر میں اُلو ہوں تو بلی کو خود ہی پکڑ کر لاؤ۔" فاروق واپس
کمرے میں آ گیا۔
"ارے ارے ..... میں تمہیں تھوڑا ہی کہہ رہا تھا —" محمود
گڑبڑا گیا —
"تو پھر کسے کہہ رہے تھے۔"
"ہے ایک لڑکا —" محمود نے اسے ٹالنے کی کوشش کی۔
"ہاں — ہے ایک لڑکا — جس کا نام 'ف' سے شروع ہوتا

ہے۔" فرزانہ نے تمسخر آمیز لہجے میں کہا۔

"اور ایک لڑکی بھی تو ہے ــــ جس کا نام 'ف' سے شروع ہو

ہے۔" فاروق نے کہا اور پیر پٹختا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ پانچ منٹ

بعد ہی وہ دوبارہ اندر داخل ہوا ــــ ایک موٹی تازی بلی اس کی بغل

میں دبی ہوئی تھی۔

"باورچی خانے میں بوٹیاں اڑا رہی تھی۔" اس نے ہنس کر کہا۔

"کیا ــــ تو اس نے ہانڈی خراب کر دی ــــ" فرزانہ نے غصے

سے کہا۔

"نہیں ــــ یہ اتنی بدتمیز نہیں ہے ــــ امی نے خود ہی دو چار

بوٹیاں اس کے آگے ڈال دی تھیں۔"

"اسے ادھر لے آؤ ــــ" محمود بولا۔

"آخر تم کرنا کیا چاہتے ہو ــــ"

"بس دیکھتے جاؤ ــــ فرزانہ کمرے کا دروازہ بند کر دو۔"

"کیوں؟"

"بلی بھاگ نہ جائے ــــ"

"کیا اس سے کشتی لڑو گے۔" فاروق نے حیرت کا اظہار کیا۔

"یہ میری عادت نہیں ــــ تم ہر ایک کو اپنے جیسا کیوں سمجھتے

ہو ــــ" محمود نے الٹا وار کیا۔

"ہائیں ــــ تمہیں بھی جملہ چست کرنا آ گیا۔" فاروق نے خوش ہو کر

کہا۔

"تمہاری صحبت کا اثر ہے۔" فرزانہ مسکرائی۔

"آہا ــــ بی مینڈکی کو بھی زکام ہو گیا۔"

"بلی کو آگے لاؤ ــــ اور باتیں ذرا کم کرو۔" محمود نے تیز لہجے میں

کہا۔

"کیوں ــــ بلی ناراض ہو جائے گی۔" فاروق مسکرایا اور بلی کو محمود

کے پاس لے گیا۔ فرزانہ دروازہ بند کر چکی تھی۔

محمود نے جیب سے ایک چاکلیٹ نکالا ــــ اس کا کاغذ اتارا اور

بلی کے منہ کی طرف بڑھا دیا ــــ بلی نے پہلے تو اسے سونگھا ــــ پھر منہ

پیچھے ہٹا لیا۔

"یہ کہہ رہی ہے ــــ بس شکریہ! آپ ہی کھائیے۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس کے ساتھ زبردستی کرنی پڑے گی۔"

محمود نے کہا۔

"کیا مطلب؟" فاروق اور فرزانہ چونک اٹھے۔

"کسی نہ کسی طرح چاکلیٹ اسے کھلانا ہے۔"

"مگر تم ایسا کیوں چاہتے ہو ــــ"

"ابھی معلوم ہو جاتا ہے۔ بلی کو پکڑ لو ــــ میں چاکلیٹ زبردستی

اس کے منہ میں ڈالوں گا ــــ"

"کہیں یہ تمہاری انگلیاں نہ چبا ڈالے۔"

"نہیں — یہ اتنی خونخوار نہیں ہے —" محمود نے کہا اور بلی کا منہ
کھول کر چاکلیٹ اندر ٹھونس دیا —
بلی پہلے تو چاکلیٹ کے منہ میں جانے سے گھبرائی — منہ سے
میاؤں کی آواز بھی نکالی لیکن پھر چاکلیٹ کا مزہ آنے پر جلدی جلدی
اسے چبانے لگی —
"دیکھو — اب کتنے مزے سے کھا رہی ہے۔" محمود خوش ہو کر
بولا۔
"تم نے بلی کا دماغ بھی خراب کر دیا۔" فاروق نے افسوس
کرتے ہوئے کہا۔
"کیا مطلب؟"
"اب اس کے لیے ہر روز چاکلیٹ لانا پڑا کرے گا۔" فاروق
مسکرایا۔ "کیا اب اسے فرش پر چھوڑ دوں۔"
"ہاں — چھوڑ دو — لیکن کمرے کا دروازہ ابھی نہ کھولنا۔"
"اچھا۔" فاروق نے بلی کو فرش پر چھوڑ دیا — وہ ایک طرف
بیٹھ کر منہ چلانے لگی —
محمود غور سے اس کی طرف دیکھ رہا — پھر پندرہ منٹ
اسی طرح گزر گئے — آخر محمود کے چہرے پر مایوسی جھلکنے لگی:
"ذرا اسے پھر پکڑنا —"
"کیوں — کیا اور چاکلیٹ کھلانا ہے۔" فاروق نے پوچھا۔

"ہاں —"
"کیوں اس کا دماغ خراب کرتے ہو۔" فاروق بولا۔
"تم پکڑو تو سہی —"
فاروق نے بلی کو پھر دبوچ لیا — اور محمود نے اس کے منہ
میں دوسرا چاکلیٹ ڈال دیا — بلی اس چاکلیٹ کو بھی کھا گئی
— اسے ایک بار پھر چھوڑ دیا گیا — اور اب پھر محمود اسے بغور دیکھ
رہا تھا۔
"آخر تم بتاتے کیوں نہیں — بلی کو چاکلیٹ کھلانے سے
تمہارا مقصد کیا ہے۔"
"ابھی تک نہیں سمجھے —"
"نہیں —"
"اور فرزانہ تم بھی نہیں سمجھ سکیں۔"
"نہیں —"
اچانک بلی کے منہ سے ایک چیخ نکلی — وہ چونک کر اس کی
طرف متوجہ ہو گئے — بلی کے جسم پر کپکپی طاری ہو گئی — دیکھتے
ہی دیکھتے کپکپی ختم ہو گئی — دوسرے ہی لمحے وہ حیرت کا بت بنے
بلی کو دیکھ رہے تھے۔
اس کی ٹانگیں مڑ گئی تھیں۔

راکھ کی چٹکی

ڈیلینٹ سویٹس کا مینجر انہیں کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر چونک اُٹھا:

"یہ انسپکٹر جمشید ہیں ـــ اور میں ان کا اسسٹنٹ۔" اکرام نے تعارف کرایا۔

"اوہ ـ آپ ـــ میں آپ کے نام سے واقف ہوں، کیسے کیسے تشریف آوری ہوئی۔" مینجر نے اخلاق کا مظاہرہ کیا۔

"بس ایسے ہی ـــ ذرا آپ کی فیکٹری دیکھنے کا موڈ ہے۔" انسپکٹر جمشید بولے:

"اوہ! ضرور ضرور ـــ شوق سے ـــ لیکن پہلے چائے وائے تو ہو جائے۔"

"نہیں ـــ اس کی ضرورت نہیں ـــ آپ ہمارے ساتھ چلیں گے یا آپ کا کوئی آدمی۔"

"نہیں ـــ میں خود ہی چلتا ہوں۔"

"تو پھر آیئے۔"

مینجر انہیں پوری فیکٹری میں گھمانے لگا۔ انہوں نے تمام کمرے

دیکھے۔ مشینیں دیکھیں۔ سب سے پہلے مینجر نے انہیں اپنا گودام دکھایا ـــ یہاں کھانڈ کی بوریاں لگی ہوئی تھی ـــ ایسنس اور دوسری چیزوں کے لیے بے شمار ٹین کے ڈبے بھی ایک دوسرے کے اوپر رکھے تھے۔ پھر وہ اس کمرے میں آئے جہاں مشینوں کے ذریعے کھانڈ کو ایک گاڑھے قوام کی شکل دی جاتی تھی۔ تیسرے کمرے میں چاکلیٹ خود کار مشینوں پر دھڑا دھڑ تیار ہو رہے تھے۔ چوتھے کمرے میں ان کے اوپر کاغذ چڑھ رہے تھے۔ اور پانچویں میں کچھ ملازم انہیں گتے کے خوبصورت ڈبوں میں بند کر رہے تھے ـــ

"بس جناب یہی کچھ ہے۔"

"ہوں ٹھیک ہے ـــ اب چلیے اپنے کمرے میں۔"

تینوں مینجر کے کمرے میں داخل ہوئے:

"آپ نے شہر میں پھیلنے والی ایک عجیب و غریب بیماری کے متعلق تو سنا ہو گا۔" انسپکٹر جمشید نے اچانک سوال کیا۔ ساتھ ہی انہوں نے مینجر کو غور سے دیکھا۔

"جی ہاں ـــ میں خود حیران ہوں کہ یہ کیسی بیماری ہے۔" اس کے چہرے پر گھبراہٹ کے آثار بالکل نہیں تھے ـــ

"آپ کے جو ملازم پیکنگ کر رہے تھے، وہ کچھ چاکلیٹ اگر کبھی لے جا سکتے ہیں؟" انسپکٹر جمشید نے عجیب سوال پوچھا۔

"جی — کیا مطلب — میں آپ کا اشارہ سمجھ نہیں سکا۔"

"جب ان کی ڈیوٹی ختم ہوتی ہے اور وہ فیکٹری سے جاتے ہیں تو کیا، ان کی تلاشی لی جاتی ہے۔"

"جی ہاں — گیٹ پر کھڑا ایک چوکیدار ان کی تلاشی لیتا ہے۔"

"ہوں۔"

"بات کیا ہے —"

"کچھ نہیں — ہمیں یونہی شک گزرا تھا۔ اچھا اب ہم چلیں گے۔" دونوں اٹھ کھڑے ہوئے۔

مینجر حیران نظروں سے انہیں فیکٹری سے باہر جاتے دیکھتا رہا:

"آپ نے اس سے کچھ معلوم تو کیا ہی نہیں۔" اکرام نے باہر آکر پوچھا۔

"ابھی نہیں — پہلے ہمیں کچھ کام کرنا ہے۔"

"جی فرمائیے۔"

"چار بجنے والے ہیں — فیکٹری کے تمام ملازم چند منٹ میں باہر آنے شروع ہو جائیں گے — تمہیں صرف ایک بات کا بغور جائزہ لینا ہے۔"

"جی وہ کیا؟"

"جتنے بھی ملازم باہر نکلتے ہیں، کیا ان سب کی تلاشی پوری طرح

لی جاتی ہے — اور اگر نہیں لی جاتی تو کس کی — بس تمہیں یہی معلوم کرنا ہے۔"

"کیا مطلب؟" اکرام چونکا۔

"میرا خیال ہے کہ ان میں سے کم از کم ایک ملازم ایسا ضرور ہے جس کی تلاشی یونہی دکھاوے کے طور پہ لی جاتی ہو گی — اور وہی ہمارے کام کا آدمی ہے۔"

"جی بہتر — میں یہ ابھی معلوم کیے لیتا ہوں —"

"تو ٹھیک ہے — میں اب چلوں گا — تم مجھے شیرازی صاحب کے فون پہ اطلاع دے سکتے ہو۔"

"جی اچھا —"

وہ موٹر سائیکل پر بیٹھ کر اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ گھر میں داخل ہوئے تو برآمدے میں ان کی بیوی تنہا بیٹھی تھیں:

"یہ تینوں کہاں چلے گئے۔"

"محمود اور فاروق اپنے کمرے میں ہیں — فرزانہ بھی وہیں ہے — کافی دیر سے وہیں گھسے ہوئے نہ جانے کیا کر رہے ہیں — ابھی ابھی فاروق بلی کو پکڑ کر لے گیا ہے۔"

"کیوں بلّی کو کیوں لے گیا ہے؟"

"خدا جانے؟"

"کہیں وہ تینوں اس بیچاری کا آپریشن نہ کر دیں — میں دیکھتا ہوں جا کر۔"

اُنھوں نے کہا اور دبے پاؤں ان کے کمرے کے دروازے تک آئے — پھر انھوں نے دروازے کے تالے کے سوراخ سے آنکھ لگا دی — وہ حیران رہ گئے — اندر کا منظر کچھ ایسا ہی حیران کن تھا۔

وہ تینوں فرش پر پڑی بلی پر جھکے ہوئے تھے اور بلی کے ہاتھ اور پاؤں مڑ گئے تھے۔ دوسرے ہی لمحے انھوں نے دروازے پر ہاتھ مارا۔

۶

دستک کی آواز نے ان تینوں کو چونکا دیا:

"کیا بات ہے امی جان —" محمود نے اندر سے پوچھا۔

"دروازہ کھولو —" انسپکٹر جمشید بولے۔

"ارے آپ۔" محمود نے گھبرا کر دروازہ کھول دیا۔

"اس بلی کو کیا ہوا —" انھوں نے پوچھا۔

"جی اسے بھی وہی عجیب و غریب بیماری ہو گئی۔" فاروق مسکرایا۔

"وہ تو میں بھی دیکھ رہا ہوں — لیکن یہ کیسے ہوا —"

"جی میں نے اسے خود اس بیماری میں مبتلا کیا ہے۔"

"کیا مطلب!" انسپکٹر جمشید بڑے زور سے چونکے — وہ اس کی بات کو سمجھ گئے تھے۔ "کیا تم نے اسے کوئی چاکلیٹ کھلایا ہے۔"

"جی! آپ کو کیسے معلوم ہوا؟" تینوں حیرت زدہ رہ گئے۔

"اگر تم اسے چاکلیٹ کھلا سکتے ہو تو میں بھی اتنی بات سمجھ سکتا ہوں۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔ "ویسے تمہارا تجربہ بہت شاندار ہے — اور میں اس عقل مندی پر جتنا بھی فخر کروں کم ہے۔"

"شکریہ ابا جان۔" محمود نے شرما کر کہا۔

"لیکن تمہیں چاکلیٹ کا خیال کیسے آیا۔"

"جی — حامد نے بھی چاکلیٹ کھائے تھے — آج ہمارے پڑوس میں جو لڑکا شکار ہوا ہے اس نے بھی چاکلیٹ کھائے تھے اور آپ نے ہمیں چاکلیٹ کھانے سے منع کیا تھا —"

"ہوں ٹھیک ہے — بالکل سامنے کی بات ہے —"

"اب ہمارا ایک اور پروگرام ہے —" محمود نے کہا۔

"اور وہ کیا؟" انسپکٹر جمشید نے دلچسپی سے پوچھا۔

"ہم اپنی بلی کو سائیں بابا کے پاس لے جائیں گے — اس کی اس بات پر فاروق اور فرزانہ ہنس پڑے لیکن انسپکٹر جمشید حیران رہ گئے۔

"کیا!"

"جی ہاں — ہم دیکھنا چاہتے ہیں کہ کیا سائیں بابا بلی کا علاج بھی کر سکتا ہے یا نہیں۔"

"ویری گڈ — بہت شاندار —" انسپکٹر جمشید کے منہ سے نکلا۔

"تو ہم اسے لے جائیں ——"

"ہاں ضرور —— اسی وقت لے جاؤ —— میں تمہارا بڑی بے چینی سے انتظار کروں گا۔"

"لیکن اگر سائیں بابا نے کچھ پیسے مانگ لیے تو؟" فرزانہ نے سوال کیا۔

"پندرہ روپے میری جیب میں ہیں۔" محمود نے جواب دیا۔

"اور دس روپے میرے پاس بھی ہیں ——" فاروق بول اٹھا۔

"تب ٹھیک ہے —— مجھے یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ میری جیب میں کوئی پیسہ ہے یا نہیں۔" فرزانہ مسکرائی۔

"تم تو ہو ہی پرلے سرے کی کنجوس۔"

"اور تم نزدیکی سرے کے ہو گے۔" فرزانہ نے بھی فوراً کہا۔

"جھگڑو نہیں —— جہاں تک میرا خیال ہے، سائیں بابا تم سے کوئی پیسہ نہیں لے گا —— آج شاید اسے بھی حیران ہونا پڑے گا —— اس نے خواب میں بھی نہ سوچا ہو گا کہ کوئی اس کے پاس بلی بھی لا سکتا ہے —— ویسے وہ منظر دیکھنے والا ہو گا —— اگر میں دو مرتبہ وہاں نہ جا چکا ہوتا تو ضرور تمہارے ساتھ چلتا۔"

"تو پھر ہمیں اجازت دیجیے —— ہم چلتے ہیں۔"

تینوں اٹھ کھڑے ہوئے۔

"جاؤ —— اور جلدی لوٹنے کی کوشش کرنا ——" انسپکٹر جمشید

بولے:

"یہ تمہیں کیا سوجھی؟" فاروق نے باہر آ کر پوچھا۔

"کمال تو یہ ہے کہ ابا جان نے بھی کوئی اعتراض نہیں کیا۔" فرزانہ بولی۔

"مانتے ہو، مجھے۔" محمود نے اکڑ کر کہا۔

"ہاں بھئی مانتے ہیں۔"

باتیں کرتے ہوئے وہ سائیں بابا کے خیمے کے پاس پہنچ گئے۔

"بس! اب باتیں بند ——"

"جی بہت اچھا۔" فاروق نے مؤدبانہ لہجے میں کہا —— فرزانہ مسکرائی۔

آج سائیں بابا کے خیمے کے آس پاس بھیڑ بہت کم تھی۔ صرف چند آدمیوں کے درمیان میں گھرے ہوئے سائیں بابا نے ان کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ آخر محمود خیمے کے اندر گھس کر بولا۔

"سائیں بابا —— میری بلی۔"

یہ ایک ایسا جملہ تھا کہ سب چونک کر انہیں دیکھنے لگے:

"جی ہاں —— اس کے بھی ہاتھ پاؤں مڑ گئے ہیں۔" محمود نے چہرے پر معصومیت طاری کر لی۔ ایک لمحے کے لیے اس نے سائیں بابا کی آنکھوں میں حیرت کی جھلک دیکھی —— یہ جھلک دوسرے ہی لمحے غائب ہو گئی اور وہ بولا۔

"آگے لے آؤ بیٹا!"

محمود نے بلی کو سائیں کے آگے ڈال دیا — اور دونوں ہاتھوں سے اسے پکڑے رہا۔ سائیں کھوئے کھوئے انداز میں بلی کی ٹانگوں کو دیکھتا رہا — پھر بولا۔

"اس کا منہ کھولو —"

محمود نے دونوں ہاتھوں سے بلی کا منہ کھول دیا۔ سائیں نے ڈبیا میں سے راکھ کی چٹکی لی اور بلی کے منہ میں ڈالی — اسی وقت محمود کا ہاتھ ہل گیا اور راکھ کی چٹکی کچھ بلی کے منہ میں گئی اور کچھ محمود کے ہاتھ پر گری۔ سائیں نے پانی کے دو تین چلو بلی کے منہ میں ٹپکا دیے اور پھر منہ ہی منہ میں کچھ پڑھنے لگا۔

خیمے میں موجود لوگوں کی آنکھیں حیرت کے مارے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں — ان کے منہ سے ایک نعرہ نکلا:

"سائیں بابا —"

اور وہ اس کے قدموں میں گر گئے۔ بلی کی ٹانگیں بالکل سیدھی ہو چکی تھیں۔

۱۷

انسپکٹر جمشید نے شیرازی صاحب کے گھر میں جا کر فون کا ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف اکرام تھا۔

"ہاں اکرام — کیا رہا؟"

"چوکیدار نے فیکٹری کے ایک ملازم کی تلاشی بہت ہی لاپروائی سے لی، بلکہ یہ کہنا درست ہوگا کہ بس دکھاوے کے طور پر لی۔"

"بہت خوب — وہ ملازم کون سا تھا — پیکنگ کرنے والوں میں سے ہی کوئی تھا نا؟"

"جی ہاں — آپ کا خیال درست ہے —"

"اس کا حلیہ بتاؤ؟"

"لمبوترا چہرہ — گنجا سر اور آنکھوں پر عینک — آنکھیں چھوٹی چھوٹی اور بھوری ناک درمیان میں سے ابھری ہوئی۔"

"ٹھیک ہے — مجھے بھی اسی پر شک تھا۔"

"اب کیا حکم ہے —"

"تم کہاں سے فون کر رہے ہو —"

"جی — میں فیکٹری کے پاس ہی ایک ڈاکخانے سے فون کر رہا ہوں۔"

"کیا وہ چلا گیا ہے؟"

"جی نہیں — سڑک کے کنارے کھڑا شاید بس کا انتظار کر رہا ہے۔"

"تو ٹھیک ہے — تم اس کا تعاقب کرو گے —"

"جی بہتر۔"

وہ واپس آئے تو انہوں نے محمود، فاروق اور فرزانہ کو برآمدے
میں بیٹھے پایا۔

"تم آگئے۔"

"جی ہاں — یہ دیکھیے — بلی ٹھیک ہو گئی۔" محمود نے فرش پر
بیٹھی بلی کی طرف اشارہ کیا۔

"کمال ہے — اس نے تم سے کوئی پیسہ تو نہیں مانگا۔"

"جی نہیں — البتہ بلی کی مڑی ہوئی ٹانگیں دیکھ کر وہ حیران
ضرور ہوا تھا۔"

"ہوں!" انسپکٹر جمشید سوچ میں ڈوب گئے۔

"ابا جان — میں نے کچھ کام کیا ہے۔" محمود بولا۔

"ہاں بیٹا — تم نے بہت شاندار کام کیا ہے۔"

"جی — آپ میرا مطلب نہیں سمجھے!" محمود نے کہا۔

"کیا مطلب؟"

"میں نے ایک اور کام بھی کیا ہے۔"

"وہ کیا —؟"

"یہ دیکھیے — یہ ہے وہ راکھ — جو سائیں اس قسم کے مریضوں
کو کھلاتا ہے — میں نے جان بوجھ کر بلی کے منہ کو ہلایا تھا — اور
اس طرح کچھ راکھ میرے ہاتھ میں گری —"

"ارے! — کمال کر دیا تم نے۔" انسپکٹر جمشید حیران رہ گئے۔

تینوں نے حیران ہو کر محمود کے بائیں ہاتھ کی ہتھیلی کو دیکھا —
دوسرے ہی لمحے ان کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

محمود کی ہتھیلی میں راکھ نہیں تھی — بلکہ راکھ سے ملتی جلتی شکل
کا ایک سفوف تھا۔

محمود اور فاروق غائب

ان کی ٹیکسی پروفیسر داؤد کی کوٹھی کے پاس رُکی—کوٹھی کے چاروں طرف پہرہ تھا لیکن انسپکٹر جمشید اور ان کے بچے اس گھر میں بلا روک ٹوک آ سکتے تھے۔ گھنٹی بجانے پر دروازہ ان کی بیٹی شائستہ نے کھولا—شائستہ انہیں دیکھ کر پھول کی مانند کھل گئی اور السلام علیکم کہہ کر فرزانہ سے چمٹ گئی۔

پروفیسر داؤد اس وقت اپنی تجربہ گاہ میں تھے—تجربہ گاہ میں بھی شائستہ اور ان کے اسسٹنٹ سرفراز کے علاوہ کسی کو داخل ہونے کی اجازت نہیں تھی لیکن اُن کے لیے یہاں بھی کوئی پابندی نہیں تھی—شائستہ انہیں لیے تجربہ گاہ میں آئی۔

"ارے! ہائیں—یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں۔" پروفیسر داؤد جو ایک خوردبین پر جھکے ہوئے تھے، انہیں دیکھ کر بولے۔

"پروفیسر انکل—میں آپ سے نہیں بولوں گی۔" فرزانہ نے منہ پھلا کر کہا۔

"وہ کیوں بیٹی—مجھ سے کیا خطا ہو گئی—"

"آپ اپنی ننھی منی ایجادات ہمیشہ فاروق کو دے دیتے ہیں

مجھے نہیں دیتے—"

"کیوں بیٹی—تم وہ گڑیا بھول گئیں—جس کی مدد سے تم نے پروفیسر جیلانی کو پکڑوایا تھا—" پروفیسر مسکرائے۔

"بس ایک گڑیا—اور ادھر فاروق کو پنسل تراش، چاکلیٹ اور نہ جانے کیا کیا چیزیں دے ڈالی ہیں۔"

"اچھا بھئی—اس مرتبہ تمہاری باری ہے—"

"اور انکل—میں کہاں جاؤں۔" محمود بول اٹھا۔

"بھئی تمہیں بھی فرزانہ کے ساتھ ہی کوئی چیز مل جائے گی۔"

"تو میں یہاں ایک منٹ نہیں ٹھہروں گا—اسی وقت واپس جا رہا ہوں۔" فاروق اُٹھ کھڑا ہوا—

"ارے ارے—صبر کرو بھئی—تمہیں بھی کچھ نہ کچھ ضرور دوں گا۔"

"دیکھا انکل جل گیا۔" فرزانہ بولی۔

"جلتی ہے میری جوتی۔" فاروق نے جل کر کہا۔

"اچھا لکڑی کی بنی ہوئی ہو گی۔" فرزانہ بول اُٹھی—اور پروفیسر داؤد ہنس پڑے۔

"اچھا اب مجھے بھی کچھ بات کرنے دو گے یا نہیں۔" انسپکٹر جمشید نے ان کی نہ ختم ہونے والی نوک جھونک سے تنگ آ کر کہا۔

"کرنے دو بھئی انہیں باتیں—دیکھتے نہیں کتنا لطف آتا ہے ان

کی باتوں ہیں۔"

"جی بس — آپ کو ہی آتا ہوگا — ہم دراصل ایک سفوف کا تجزیہ کرانے آئے ہیں۔"

"کیا مطلب؟" پروفیسر چونکے۔

"یہ رہا وہ سفوف۔" انسپکٹر جمشید نے جیب میں سے ایک چھوٹی سی پڑیا نکال کر کہا۔

پروفیسر داؤد نے پڑیا کھولی اور اس سفوف کو دیکھنے لگے۔

"کیا یہ راکھ ہے۔" انسپکٹر جمشید نے پوچھا۔

"راکھ — ؟ نہیں راکھ تو نہیں ہے — یہ تمہیں کہاں سے ملا — "

"یہ بعد میں بتائیں گے — پہلے آپ دیکھ کر بتائیں — یہ ہے کیا۔"

"اچھا۔"

پروفیسر داؤد سفوف لے کر سائنسی آلات کی طرف مڑ گئے اور وہ آپس میں باتیں کرنے لگے۔ چند منٹ بعد ہی پروفیسر داؤد ان کی طرف مڑے:

"یہ راکھ نہیں ہے — البتہ ایک قسم کا زہر ہے۔" وہ بولے۔

"زہر۔" ان کے منہ سے نکلا۔

"ہاں! لیکن یہ زہر کچھ خاص قسم کے جراثیم کو مارنے کے کام

آتا ہے۔"

"کیا!" انسپکٹر جمشید چلائے۔

"ہاں — مثلاً اگر تمہارے خون میں کچھ نقصان دہ جراثیم شامل ہوجائیں اور یہ سفوف کھلا دیا جائے تو وہ جراثیم ہلاک ہوجائیں گے اور تمہیں کوئی نقصان بھی نہیں پہنچے گا۔"

"لیکن جراثیم خون میں داخل کیسے ہوسکتے ہیں — میرا مطلب ہے کیا خوراک کے ذریعے ..... یا کسی اور طرح۔"

"جراثیم خون میں کئی ذریعوں سے داخل ہوسکتے ہیں — خوراک کے ذریعے بھی دیے جائیں تو خون میں شامل ہوجائیں گے۔"

"بس ٹھیک ہے — مسئلہ حل ہوگیا۔"

"کیسا مسئلہ — بات کیا ہے۔" پروفیسر داؤد نے پوچھا۔

"یہ وہ راکھ ہے جو سائیں بابا اپنے مریضوں کو کھلاتا ہے۔"

"تمہارا مطلب ہے — ان بچوں کو جن کے ہاتھ پیر مڑ جاتے ہیں۔" پروفیسر صاحب نے حیران ہوکر پوچھا۔

"جی ہاں!"

"تم ایک بہت ہی حیران کن بات بتا رہے ہو۔" ان کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔

اس پر انسپکٹر جمشید نے انہیں سارا واقعہ سنایا۔

"کمال ہے — تم لڑکوں اور لڑکیوں سے بلیوں پر جا پہنچے۔"

انہوں نے محمود کی طرف دیکھ کر کہا۔

"اب میں چاہتا ہوں آپ ان چاکلیٹوں کا معائنہ بھی کریں۔" انسپکٹر جمشید نے کہا۔

"بھئی میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں۔ جراثیم میری لائن کی چیز نہیں ہیں۔ تاہم میں دیکھے لیتا ہوں۔" پروفیسر بولے۔

محمود کی جیب میں اس وقت تین چاکلیٹ باقی تھے — وہ اس نے پروفیسر صاحب کو دے دیے اور وہ ایک بار پھر سائنسی آلات کی طرف مڑ گئے۔

جب وہ ان کی طرف واپس آئے تو ان کے الفاظ نے انہیں متحیر کر دیا۔

"یہ چاکلیٹ بالکل بے ضرر ہیں — ان میں کچھ نہیں ہے۔"

"لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے — میں نے پانچ چاکلیٹ خریدے تھے — ان پانچ میں سے ہی دو بلی کو کھلائے تھے۔"

"کیا پہلے چاکلیٹ پر ہی بلی کے پیر مڑ گئے تھے۔" انسپکٹر جمشید نے پوچھا۔

"جی نہیں — پہلا چاکلیٹ کھلا کر میں نے کچھ دیر انتظار کیا تھا جب کچھ نہ ہوا تو دوسرا کھلایا — اس کے چند منٹ بعد ہی اس کی ٹانگیں مڑ گئی تھیں۔"

"تب تو بات صاف ہو جاتی ہے۔" پروفیسر داؤد بولے۔

"جی ہاں — اب کوئی اُلجھن باقی نہیں رہی —"

"کیا مطلب — ہم نہیں سمجھے۔" فاروق نے پوچھا۔

"کمال ہے — تم اتنی سی بات بھی نہیں سمجھ سکے۔" فرزانہ بولی۔

"تم تو سمجھ گئی ہو نا — تو بتاتی کیوں نہیں —"

"اس سے صاف ظاہر ہے کہ ان پانچ چاکلیٹوں میں سے وہ ایک چاکلیٹ ٹھیک نہیں تھا۔"

"اتنی بات تو میں بھی سمجھ گیا تھا — سوال تو یہ ہے کہ وہ چاکلیٹ کیوں ٹھیک نہیں تھا۔"

"اس میں جراثیم شامل کر دیے گئے تھے۔" محمود بول اٹھا۔

"بالکل ٹھیک ہے۔" پروفیسر داؤد بولے۔

"محمود — تم اسی وقت جاؤ — اور کسی دکان سے چاکلیٹ کا ایک پورا پیکٹ خرید لاؤ۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"پورا پیکٹ؟" محمود نے حیران ہو کر کہا۔

"ہاں — ہم دیکھیں گے کہ ایک پورے پیکٹ میں کتنے چاکلیٹ جراثیم آلود ہیں۔" انہوں نے جیب سے پیسے نکالتے ہوئے کہا۔

محمود اور فاروق پیسے لے کر گھر سے نکل گئے۔

۶

پروفیسر داؤد کے فون کی گھنٹی بجی۔ انسپکٹر جمشید نے ہاتھ بڑھا

کر ریسیور اٹھا لیا۔ دوسری طرف اکرام تھا۔

"ہیلو اکرام — کیا رپورٹ ہے۔"

"فیکٹری کا ملازم سڑک پر بس کا نہیں ٹیکسی کا انتظار کر رہا تھا۔" اکرام نے بتایا۔

"اوہ!"

"جی ہاں — ٹیکسی میں بیٹھ کر وہ ایک کوٹھی تک پہنچا تھا — نیچے اتر کر اس نے بل ادا کیا اور ٹیکسی کے چلے جانے کے بعد اس کوٹھی سے پندرہ قدم آگے ایک کوٹھی میں داخل ہوا — اندر سے وہ تقریباً پندرہ منٹ بعد واپس آیا۔ اس مرتبہ پھر اس نے ایک ٹیکسی پکڑی اور اپنے گھر پہنچا — یہ بہت معمولی سا مکان ہے — اور اب میں اس کے پاس سے ہی فون کر رہا ہوں —"

"کیا تم اس کوٹھی کا نمبر نوٹ کر چکے ہو۔"

"جی ہاں —"

"بس تو ٹھیک ہے — اب اس کی نگرانی کرنے کی ضرورت نہیں — اب تم گھر جا سکتے ہو۔"

"جی بہتر۔"

انہوں نے فون کا ریسیور رکھ دیا، اور پروفیسر داؤد سے بولے۔

"تفتیش بہت تیزی سے آگے بڑھ رہی ہے۔"

"اچھا — کیا کوئی خاص بات معلوم ہوئی ہے۔"

"ہاں — بہت ہی خاص۔"

"جو تم بتاؤ گے نہیں۔"

"جی ہاں — فی الحال میں اسے اپنے تک ہی رکھنا چاہتا ہوں۔"

"خیر کوئی بات نہیں۔"

"ابا جان! محمود اور فاروق اب تک نہیں آئے۔" فرزانہ بولی — وہ کچھ بے چینی محسوس کر رہی تھی۔

"کوئی دوکان نزدیک نہیں ملی ہو گی۔"

"ہاں — جنرل مرچنٹ کی دکانیں یہاں سے قدرے فاصلے پر ہیں۔"

"اوہ۔" فرزانہ نے اطمینان کا سانس لیا۔

اسی وقت دونوں اندر داخل ہوئے۔ محمود کے ہاتھ میں چاکلیٹ کا ڈبہ تھا۔

"لیجیے ابا جان۔"

"مجھے دو بیٹا۔" پروفیسر داؤد نے کہا — اور ڈبہ لے کر مشینوں کی طرف چلے گئے۔

"ابا جان! فرض کیجیے کہ اس ڈبے میں سے کچھ جراثیم آلود چاکلیٹ نکل آتے ہیں — پھر —" فرزانہ نے پوچھا۔

"صرف فرض کرنے سے کام نہیں چلا کرتا۔" فاروق نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"کیوں۔۔۔چل کیوں نہیں سکتا۔"

"تو کیا چل سکتا ہے۔" فاروق نے الٹا سوال کیا۔

"کیوں نہیں۔۔۔ہم سکول میں حساب اور الجبرے کے بہت سے سوال نکالتے ہیں۔۔۔جو فرض کرنے سے نکلتے ہیں۔" فرزانہ نے جواب دیا۔

"فرزانہ کی یہ بات ٹھیک ہے فاروق۔۔۔بعض اوقات فرض کرنے سے بھی کام نکل آتا ہے۔"

"لیکن ابا جان۔۔۔پروفیسر انکل چاکلیٹوں کا معائنہ کر رہے ہیں۔ ایسی صورت میں فرض کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔"

"ارے نہیں بھئی۔۔۔میں اس وقت تک تین چاکلیٹ ایسے نکال چکا ہوں، جن میں جراثیم موجود ہیں۔" پروفیسر بولے۔

"اوہ!" ان کے منہ سے نکلا۔

۱۱

"دھم" کمرے کے باہر ہلکی سی آواز گونجی اور فرزانہ کی آنکھ کھل گئی۔۔۔تھوڑی دیر تک وہ سوچتی رہی کہ اس کی آنکھ کیوں کھلی ہے۔ پھر اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔۔۔اور پھر سو گئی۔۔۔لیکن چند منٹ بعد ہی اس کی آنکھ دوبارہ کھل گئی اور اسے یاد آیا کہ اس نے "دھم" کی آواز سنی تھی۔۔۔وہ چارپائی سے اٹھی۔۔۔اپنے کمرے

سے باہر نکلی۔۔۔اور محمود اور فاروق کے کمرے میں داخل ہوئی۔۔۔دوسرے ہی لمحے وہ دھک سے رہ گئی۔۔۔آنکھیں خوف سے پھیل گئیں۔۔۔پھر دوڑتی ہوئی اپنے ابا جان کے کمرے کی طرف آئی اور دروازے پر ہی چلّانے لگی۔۔۔

"ابا جان۔۔۔وہ۔۔۔وہ اپنے کمرے میں نہیں ہیں۔۔۔"

انسپکٹر جمشید گہری نیند سو رہے تھے۔ آخر فرزانہ اندر داخل ہوئی۔۔۔انسپکٹر جمشید کو جھنجھوڑنے لگی۔

"کیا ہوا۔۔۔کیا بات ہے بیٹی۔" وہ ہڑبڑا کر اُٹھے۔

"جی۔۔۔وہ۔۔۔وہ اپنے کمرے میں نہیں ہیں۔"

"کون۔۔۔محمود اور فاروق۔"

"جی ہاں۔۔۔"

"اوہ۔۔۔" انسپکٹر جمشید تیزی سے اُٹھے اور ان کے کمرے کی طرف دوڑے۔۔۔شور کی وجہ سے بیگم جمشید کی آنکھ کھل گئی۔

اور وہ بھی ان کے پیچھے لپکیں۔

کمرہ خالی پڑا تھا۔۔۔بائیں باغ والی کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔

انسپکٹر جمشید بغور کمرے کا جائزہ لے رہے تھے۔

"کیا ان دونوں کو اغوا کیا گیا ہے۔" بیگم جمشید نے گھبرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"نہیں ——— وہ دونوں اپنی مرضی سے کمرے سے باہر گئے ہیں۔ البتہ وہ اس کھڑکی سے کود کر باہر گئے ہیں۔"

اب فرزانہ کو 'دھم' کی آواز سمجھ میں آئی۔

"آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ وہ اپنی مرضی سے گئے ہیں اور کوئی انہیں اٹھا کر نہیں لے گیا ہے۔"

"کمرے میں ہر چیز اپنی جگہ پر ہے ——— دونوں کی جوتیاں موجود نہیں ہیں۔"

"ہو سکتا ہے کہ انہیں پستول کے زور پر لے جایا گیا ہو۔"

"نہیں ——— اگر ایسا ہوتا تو کمرے میں ضرور کوئی بے ترتیبی پائی جاتی ——— وہ اتنے بے وقوف نہیں ہیں ———"

"لیکن سوال تو یہ ہے کہ وہ اس وقت کہاں گئے ہیں۔" بیگم جمشید بولیں ———

"میں خود حیران ہوں ———"

"ابا جان! وہ ضرور سائیں بابا کے خیمے کی طرف گئے ہیں۔" فرزانہ نے خیال ظاہر کیا۔

"شاید تم ٹھیک کہتی ہو ——— اچھا ——— میں انہیں دیکھ کر آتا ہوں۔"

"ابا جان ——— کیا میں بھی چلوں۔"

"نہیں بیٹی ——— رات کا وقت ہے ——— تم آرام کرو یا پھر میرا

انتظار کرو۔"

"جی ——— ہم آپ کا انتظار کریں گے۔"

انسپکٹر جمشید نے جلدی جلدی کپڑے پہنے اور گھڑی پر نظر ڈالی ——— رات کے گیارہ بج رہے تھے ——— وہ گھر سے باہر نکل آئے اور پیدل ہی اکبر روڈ کی طرف چل پڑے۔

جب وہ خیمے کے پاس پہنچے، پہلی مرتبہ انہیں احساس ہوا کہ محمود اور فاروق ضرور کسی مصیبت میں گرفتار ہو گئے ہیں کیونکہ خیمے کے آس پاس کوئی نہ تھا ——— اور خیمہ بھی خالی پڑا تھا ———

وہ واپس مڑے اور چند قدم ہی چلے تھے کہ رُک گئے ——— زمین پر ایک رومال پڑا تھا ——— یہ فاروق کا تھا۔

گدڑی میں پستول

"اُمید ہے فرزانہ سو چکی ہو گی۔" فاروق نے چارپائی پر اُٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"ہاں!" محمود نے جواب دیا۔

"تو کیا ہم چلیں؟"

"ہاں —— گیارہ بجنے والے ہیں۔ ہم خاموشی سے جائیں گے اور اسی طرح واپس آ جائیں گے۔"

"تو چلو پھر۔" فاروق بولا۔

محمود نے پائیں باغ میں کھلنے والی کھڑکی کھولی اور اسے پھلانگ کر باغ میں آ رہا۔ اس کے پیچھے فاروق نے بھی چھلانگ لگائی —— اب ان دونوں کا رُخ اکبر روڈ کی طرف تھا۔ رات چاندنی تھی۔ سردی کا موسم شروع ہو چکا تھا —— باہر نکلنے پر انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوا —— وہ صرف قمیص اور پاجامے میں نکل آئے تھے۔ ٹھنڈی ہوا ان کے جسموں سے ٹکرائی تو وہ کپکپا اُٹھے۔

"ہمیں کوٹ پہن کر نکلنا چاہیے تھا۔" محمود نے کہا۔

"کوٹ اور سویٹر ابھی صندوقوں میں سے نکالے ہی کہاں ہیں

ہم نے یہ پروگرام دن کے وقت بنایا تھا۔ اور دن میں اس وقت چونکہ سردی نہیں تھی اس لیے اس طرف خیال بھی نہیں گیا۔" فاروق نے کہا۔

"ہاں! یہ بھی ٹھیک ہے —— خیر اب کیا ہو سکتا ہے۔" محمود نے اپنا سر زور سے جھٹکا۔

"سڑک کس قدر ویران ہے —— دُور دُور تک کوئی انسان نظر نہیں آتا۔" فاروق چاندنی رات میں چمکتی ہوئی سڑک پر دیکھتے ہوئے بولا۔

"ہمیں تیز تیز قدم اٹھانے چاہییں —— تاکہ جلد واپس پہنچ سکیں اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔"

"ٹھیک ہے۔"

دونوں تیزی سے آگے بڑھنے لگے —— یہاں تک کہ وہ سائیں بابا کے خیمے کے پاس پہنچ گئے۔ دُور سے انہیں جنگل میں خیمہ دکھائی نہیں دیا —— لیکن نزدیک آنے پر وہ انہیں نظر آنے لگا۔

"کیا سائیں بابا اس وقت موجود ہو گا ——" فاروق بول اٹھا۔

"اگر وہ سائیں ہے تو ضرور موجود ہو گا۔" محمود نے کہا۔

"اس کی موجودگی میں ہم کیا کر سکیں گے؟"

"دیکھا جائے گا۔ ویسے بھی اگر سائیں بابا خیمے میں موجود ہوا تو ہمیں خیمے کی تلاشی لینے کی ضرورت ہی کہاں رہے گی۔"

"یہ بھی ٹھیک ہے۔"

اب وہ خیمے کے بالکل قریب پہنچ چکے تھے — اسی وقت سرد ہوا کی وجہ سے فاروق کو چھینک آنے لگی — اس کا منہ کھلا ہی تھا کہ اس نے تیزی سے جیب سے رومال نکالا اور منہ پر رکھ لیا تاکہ آواز نہ اُبھرے — چھینک درمیان میں ہی رہ گئی — اچانک محمود نے اپنا منہ اس کے کان کے پاس لے جا کر کہا۔

"یہ رومال یہیں — زمین پر گرا دو۔" محمود کو اچانک کوئی خیال آیا تھا۔

"کیوں؟" فاروق نے حیران ہو کر پوچھا — "کیا اس میں تمہیں کوئی بھوت نظر آ گیا ہے۔" فاروق نے دھیمی آواز میں کہا۔

"تم سمجھے نہیں —" محمود بولا۔

"اوہ — سمجھ گیا — ٹھیک ہے — میں نے رومال گرا دیا ہے۔"

"ٹھیک ہے — اب آگے بڑھو —"

خیمے کے دروازے کا پردہ گرا ہوا تھا — دونوں دبے پاؤں دروازے تک پہنچے، ان کے دل دھک دھک کر رہے تھے۔ محمود نے ہمت کر کے خیمے کا پردہ تھوڑا سا کھسکایا — لیکن اندر تاریکی تھی۔ انہیں کچھ نظر نہ آ سکا — دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا — آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو اشارہ کیا — اور پھر محمود نے دروازے کا پردہ اُلٹ دیا — اب چاند

کی روشنی میں خیمے کے اندر دیکھا جا سکتا تھا — دوسرے ہی لمحے ان کی آنکھیں خوف کی وجہ سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں — دو سُرخ سُرخ — انگارا سی آنکھیں انہیں گھور رہی تھیں — ان پر کپکپی طاری ہو گئی۔

اچانک ان دونوں کے سروں پر کوئی چیز زور سے لگی اور وہ چکرا کر زمین پر گرے اور بے ہوش ہو گئے۔

۶

انہوں نے جھک کر فاروق کا رومال اُٹھا لیا۔ کچھ دیر اسی جگہ کھڑے سوچتے رہے — پھر واپس مڑے، خیمے کے دروازے کا پردہ اٹھا کر خیمے کی چھت پر ڈالا — اور اندر داخل ہو گئے — اب وہ خیمے کی تمام چیزوں کو بغور دیکھ رہے تھے۔ خیمے میں انہیں کوئی کام کی چیز نظر نہیں آئی — اور ہر چیز اپنی جگہ پر تھی۔ انہوں نے سائیں بابا کے لیٹنے کی جگہ کو چھو کر دیکھا — جگہ انہیں کچھ گرم محسوس ہوئی — وہ خیمے سے باہر نکلے — اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر ایک خیال آنے پر مسکرا اُٹھے ...... وہ یہاں آئے ضرور تھے — لیکن کام کی کوئی چیز نہ پا کر لوٹ گئے — ہو سکتا ہے سائیں بابا ان سے کچھ ہی دیر پہلے یہاں سے گیا ہو — لیکن کہاں — کیا اس کی سونے کی جگہ الگ ہے۔ مجھے گھر چل کر دیکھنا چاہیے۔

دونوں ضرور گھر پہنچ چکے ہوں گے — ہاں — ہو سکتا ہے وہ واپس دوسرے راستے سے گئے ہوں۔

اس خیال کے آتے ہی وہ واپس پلٹے — اور گھر کی طرف تیز تیز قدم اٹھانے لگے — گھر پہنچے تو بیگم جمشید نے دروازہ کھولا — وہ بہت بے چین تھیں — ان کے پیچھے فرزانہ بھی کچھ کم پریشان نہ تھی — انسپکٹر جمشید سمجھ گئے۔

"تو وہ دونوں ابھی تک گھر نہیں پہنچے —"

"جی نہیں — کیا وہ آپ کو نہیں ملے۔"

"نہیں — لیکن میرا خیال تھا کہ وہ یہاں پہنچ چکے ہوں گے۔"

"آپ انہیں کہاں دیکھنے گئے تھے۔" فرزانہ نے پوچھا۔

"تمہارے خیال میں وہ کہاں جا سکتے ہیں — کیا تمہیں ان کے کسی پروگرام کا علم ہے۔" انسپکٹر جمشید نے جواب دینے کی بجائے سوال کر ڈالا۔

"جی نہیں — مجھے ان کے کسی پروگرام کا تو پتا نہیں البتہ اتنا ضرور جانتی ہوں وہ سائیں بابا کے خیمے کی طرف گئے ہوں گے۔"

"ٹھیک ہے — وہ ادھر ہی گئے تھے۔" وہ بولے۔

"کیا؟ — تو کیا وہ آپ کو وہاں ملے ہیں۔" بیگم جمشید نے گھبرا کر پوچھا۔

"نہیں۔"

"پھر آپ نے کیسے کہہ دیا کہ وہ وہاں ہی گئے تھے۔"

"مجھے خیمے کے پاس سے فاروق کا رومال ملا ہے۔" انہوں نے کہا اور جیب سے فاروق کا رومال نکال کر انہیں دکھایا — دونوں نے رومال کو غور سے دیکھا۔

"رومال تو فاروق کا ہی ہے — آخر بات کیا ہے — آپ بتاتے کیوں نہیں۔"

"وہ دونوں وہاں تک پہنچے ضرور ہیں، اس کے بعد ان کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا، یہ نہیں معلوم — ہو سکتا ہے وہ وہاں سے کسی کے پیچھے گئے ہوں اور تھوڑی دیر تک واپس آ جائیں۔"

"لیکن رومال وہاں کیوں پڑا ملا — اس سے تو خطرے کی بو آتی ہے۔"

"تم ان دونوں کو نہیں جانتیں — انہوں نے احتیاطاً رومال زمین پر گرا دیا ہوگا — تاکہ اگر وہ کسی مصیبت میں گرفتار ہو جائیں تو مجھے معلوم ہو جائے کہ وہ وہاں پہنچے تھے۔"

"ہاں! یہ ٹھیک ہے۔" فرزانہ بولی۔

"لیکن — ! سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کیا جائے — خدا جانے وہ کہاں ہیں — ان پر کیا بیتی —"

"آپ اپنے ماتحتوں کو کیوں نہیں بلواتے — ان کی مدد سے تلاش کروائیے —"

"ہاں ـــ اب یہی کرنا ہو گا - اچھا ـــ میں فون کر کے آتا ہوں تم دروازہ اندر سے بند رکھنا۔"

ان کی وہ رات دوڑ دھوپ میں گزر گئی مگر محمود اور فاروق کا کہیں پتا نہ چلا۔ صبح کے اخبار میں پہلے صفحے پر یہ خبر شائع ہوئی۔

انسپکٹر جمشید کے بچے غائب!

نیچے تفصیل درج تھی۔ ادھر انسپکٹر جمشید فرزانہ اور بیگم جمشید کا حال بُرا تھا ـــ وہ سخت پریشان تھا ـــ وہ آج دفتر بھی نہیں گئے تھے ـــ صبح سے انہوں نے کچھ کھایا پیا بھی نہ تھا ـــ اچانک دروازے کی گھنٹی بجی ـــ فرزانہ نے دروازہ کھولا اور اکرام کو ساتھ لیے اندر داخل ہوئی ـــ اکرام کی آنکھیں بھی رات بھر جاگتے رہنے کی وجہ سے سُرخ تھیں مگر اس کے چہرے پر تھکن کے آثار نہیں تھے۔

"کہو اکرام ـــ کیا رہا ـــ"

"ہر طرف تلاش جاری ہے ـــ ابھی تک کوئی پتا نہیں چلا۔"

"ہوں ـــ کیا تم جیپ پر آئے ہو۔"

"جی ہاں!"

"ٹھیک ہے ـــ اب مجھے ہی اٹھنا پڑے گا ـــ شہر میں بچوں کے نہ ملنے کا صرف ایک ہی مطلب ہو سکتا ہے۔"

"کیا مطلب۔"

"آؤ میرے ساتھ۔" انسپکٹر جمشید اُٹھ کھڑے ہوئے۔

"ابا جان! میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گی۔" فرزانہ بول اُٹھی۔

"اور گھر میں تمہاری امّی جو پریشان رہیں گی۔"

"آپ میری فکر نہ کریں ـــ اسے بھی لے جائیں اور خدا کے لیے میرے بچّوں کو ڈھونڈ لائیں۔"

تینوں باہر نکل کر جیپ میں بیٹھ گئے۔

"کس طرف چلنا ہے۔" اکرام نے سٹیرنگ سنبھالتے ہوئے کہا۔ انجن پہلے ہی سٹارٹ تھا۔

"اکبر روڈ ـــ سائیں بابا کے خیمے تک جانا ہے۔"

"جی!" اکرام کے منہ سے نکلا۔

"چلو بھئی ـــ حیران بعد میں ہو لینا۔"

"لیکن ان اطراف میں تو ہم رات سے ہی تلاش میں معروف ہیں ـــ"

"تم چلو تو سہی ـــ کیا سائیں بابا اپنے خیمے میں موجود ہے۔"

"صبح تو موجود نہیں تھا۔"

"ٹھیک ہے، میں یہی دیکھنا چاہتا ہوں، کہ وہ آ گیا ہے یا نہیں۔"

"لیکن ـــ ان کے غائب ہونے سے سائیں بابا کا کیا تعلق۔" اکرام نے اُلجھ کر کہا۔

"فاروق کا رومال مجھے خیمے کے پاس سے ملا ہے۔"

"اوہ!" اکرام کا منہ حیرت سے کھل گیا۔

"کیا آپ اسے گرفتار کرنا چاہتے ہیں۔" اس نے حیرت پر قابو پاکر پوچھا۔

"ہاں! خیال تو یہی ہے۔"

"گرفتار کرنے کا کوئی جواز بھی تو ہو — کوئی وجہ بھی تو ہونی چاہیے۔"

"وجہ ہی ڈھونڈنے جا رہا ہوں۔"

خیمے کے پاس پہنچ کر اکرام نے جیپ سڑک کے کنارے روک لی۔ آس پاس انہیں دو تین کانسٹیبل بھی نظر آئے۔

"انہیں ہوشیار رہنے کا اشارہ کر دو۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"جی بہتر!" اکرام نے کانسٹیبلوں کو اشاروں میں سمجھا دیا۔

خیمے کے دروازے پر انہیں ہر روز کی طرح بھیڑ نظر آئی — وہ تینوں خیمے میں گھس گئے — اکرام پولیس کی وردی میں تھا۔ لوگوں نے ان کے لیے راستہ چھوڑ دیا — خیمے کے بیچ میں سائیں بابا موجود تھا۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا۔

"بابا — آپ رات کے وقت کہاں تھے؟" انسپکٹر جمشید نے اچانک زوردار آواز میں سوال کیا۔

خیمے میں سناٹا چھا گیا — انسپکٹر جمشید نے اسے چونکتے دیکھا۔

"یہ کون گستاخ ہے —"

"رات تم کہاں تھے؟" انسپکٹر جمشید کا لہجہ سخت ہو گیا — اکرام چونک اُٹھا۔

"تم کیا چاہتے ہو —" اس نے پہلی بار نظریں اٹھائیں۔

"میں پولیس کا ایک افسر یہ جاننا چاہتا ہوں — اور اگر تم نے اس سوال کا جواب تسلی بخش نہ دیا تو تمہیں گرفتار کر لیا جائے گا۔"

"ہمیں گرفتار کر لو گے۔" سائیں بابا نے ایک قہقہہ لگایا۔ "اللہ والوں کو گرفتار کر لو گے — تم اندھے ہو — تمہارا بُرا وقت آ گیا ہے — میں تمہیں بھسم کر دوں گا۔"

"تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔" انسپکٹر جمشید نے پرسکون آواز میں کہا۔

"میں اپنے خیمے سے کہیں نہیں جاتا — ہر وقت خیمے میں رہتا ہوں۔"

"لیکن — رات تم خیمے میں نہیں تھے۔"

"کون کہتا ہے؟" سائیں بابا نے گرجدار آواز میں کہا۔

"میں کہتا ہوں — پولیس کا یہ دوسرا آفیسر کہتا ہے — اس کے ساتھ چند کانسٹیبل بھی ہیں — وہ بھی اس بات کے گواہ ہیں کہ تم رات خیمے میں نہیں تھے۔"

"رات کے وقت ہمیں صرف دل کی آنکھوں سے دیکھا جا سکتا ہے۔۔۔ساری رات ہم عبادت میں مصروف رہتے ہیں۔۔۔اور جب ہم عبادت میں مصروف ہوں، ہم کسی کو نظر نہیں آتے۔"

"بہت خوب۔۔۔اب ہم اس خیمے کی تلاشی لیں گے۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"ہماری تلاشی لو گے۔۔۔اپنے آپ کو تباہ کرنے پر کیوں تُلے ہو۔"

اکرام نے خیمے سے باہر نکل کر کانسٹیبلوں کو اشارہ کیا۔۔۔ وہ اس کی طرف لپکے:

"خیمے کی تلاشی لو۔۔۔"

"تباہ ہو جاؤ گے۔۔۔برباد ہو جاؤ گے۔۔۔اندھے ہو جاؤ گے۔۔۔"

سائیں بابا چلاتا رہا اور کانسٹیبل خیمے کی تلاشی لیتے رہے، لیکن انہیں خیمے میں سے کوئی قابلِ اعتراض چیز نہ ملی۔ فرزانہ بھی کانسٹیبلوں کا ساتھ دے رہی تھی۔ تلاشی لیتے لیتے وہ سائیں بابا کی پشت پر پہنچ گئی۔

"اکرام۔۔۔تم نے وہ کہاوت سُنی ہے نا۔۔۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"کونسی سر!"

"گدڑی میں لعل۔"

"یس سر!"

"تو تم بھی بابا کی گدڑی کی تلاشی لو۔۔۔"

"ہرگز نہیں۔۔۔میری گدڑی کے پاس بھی نہ آنا۔۔۔اب میں برداشت نہیں کر سکتا۔"

اکرام نے اس کی بات پر کوئی دھیان نہ دیا۔۔۔اور گدڑی کی طرف قدم بڑھایا۔۔۔یہ دیکھ کر سائیں بابا واقعی برداشت نہ کر سکا۔ اس نے جھٹ گدڑی اپنے قبضے میں کر لی۔۔۔دوسرے ہی لمحے اس کا ہاتھ گدڑی میں رینگ گیا۔۔۔

پھر وہ سب ہی حیران رہ گئے۔۔۔گدڑی میں سے کوئی لعل نہیں نکلا تھا۔۔۔سائیں بابا کے ہاتھ میں ایک سیاہ رنگ کا خوف ناک پستول چمک رہا تھا۔

سائیں بابا کے معتقدین کی آنکھیں حیرت اور خوف سے پھیل گئیں۔۔۔وہ سب تھر تھر کانپنے لگے۔

موت کے منہ میں

"خبردار کوئی اپنی جگہ سے حرکت نہ کرے۔" سائیں بابا گرجا
"بہت خوب ــــ یہ ہوئی نا کام کی بات ــــ کیوں اکرام
کیا خیال ہے۔" انسپکٹر جمشید نے خوش ہو کر کہا۔
"حیرت انگیز ــــ آپ بھی کمال کرتے ہیں۔" اکرام نے حیران
ہو کر کہا۔
"خاموش ــــ تمہاری زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکلے۔"
سائیں بابا نے دوبارہ گرج کر کہا ــــ "میں تم سب کو زندہ
نہیں چھوڑوں گا۔"
"لیکن تمہارے ان ماننے والوں کا کیا قصور ــــ انہیں کیوں
مارتے ہو۔"
"انہیں نہیں ــــ میں تمہاری بات کر رہا ہوں۔"
"تو پھر انتظار کس بات کا ہے ــــ گولی کیوں نہیں چلاتے؟"
انسپکٹر جمشید نے کہا ــــ وہ دراصل اسے باتوں میں لگائے رکھنا
چاہتے تھے ــــ فرزانہ کھسکتی ہوئی اس کے عین پیچھے پہنچ چکی تھی
جب کہ سائیں بابا اس کی موجودگی سے بے خبر تھا۔

"کیا تم موت سے نہیں ڈرتے۔" سائیں نے پوچھا۔
"نہیں ــــ کیونکہ ایک دن تو مرنا ہی ہے۔"
"اچھا ــــ تو یہ لو ــــ" اس نے پستول والا ہاتھ سیدھا کیا۔
عین اسی وقت فرزانہ کا ہاتھ چل گیا ــــ اس کے ہاتھ میں ایک
لکڑی تھی جو اس نے پستول والے ہاتھ پر دے ماری۔ پستول سائیں
کے ہاتھ سے نکلا اور دور جا گرا ــــ اکرام نے پستول پر چھلانگ
لگائی ــــ ساتھ ہی سائیں نے خیمے سے باہر چھلانگ لگائی اور یہ جا
وہ جا ــــ
انسپکٹر جمشید اور کانسٹیبل اس کے پیچھے دوڑے ــــ اکرام نے
پستول اٹھا کر سائیں پر فائر کرنا چاہا لیکن راستے میں کئی آدمی
حائل ہو چکے تھے ــــ
"فرزانہ ــــ تم یہیں ٹھہرو ــــ کسی کو کوئی چیز ادھر ادھر نہ
کرنے دینا۔" یہ کہہ کر اکرام بھی ان کے پیچھے بھاگا ــــ
اب وہ سب بے تحاشہ بھاگ رہے تھے ــــ سب سے آگے سائیں
تھا ــــ اس کے پیچھے انسپکٹر جمشید تھے اور ان کے پیچھے کانسٹیبل اور
اکرام ــــ انسپکٹر جمشید پوری کوشش کے باوجود بھی درمیانی فاصلے
کو گھٹانے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ سائیں بابا کی رفتار حیرت انگیز
حد تک تیز تھی۔ انسپکٹر جمشید نے پستول نکالنے کے لیے جیب میں
ہاتھ ڈالا اور اب انہیں یاد آیا کہ گھر سے چلتے وقت انہوں نے

پستول نہیں لیا تھا — در اصل انہوں نے ضرورت ہی محسوس نہیں کی تھی — اور اب سائیں بابا لمحہ بہ لمحہ ان سے دور ہوتا جا رہا تھا — کچھ اس لیے بھی کہ وہ ننگے پاؤں تھا اور ان کے پیروں میں وزنی جوتے تھے۔

جنگل بہت گھنا تھا — اور گھنے جنگل میں پوری رفتار سے دوڑنا آسان نہیں تھا — پھر بھی وہ سب سر توڑ کوشش کر رہے تھے اور بے تحاشہ بھاگ رہے تھے۔ ایک جگہ سائیں بابا ان کی نظروں سے اوجھل ہو گیا — کیونکہ یہاں جھاڑیاں بہت گھنی تھیں اور وہ شاید ان میں ہی کہیں دبک گیا تھا۔

"اب اسے پکڑنا بہت مشکل ہے۔" انسپکٹر جمشید نے ہانپتے ہوئے کہا۔ اکرام ان کے پاس پہنچ چکا تھا۔

"چاروں طرف پھیل جاؤ۔" اکرام نے کانسٹیبلوں سے کہا۔

وہ آدھ گھنٹے تک مارے مارے پھرتے رہے — پھر انہیں بہت دور ایک موٹر سائیکل سٹارٹ ہونے کی آواز سنائی دی۔

وہ اس طرف دوڑے — انہوں نے دور سے دیکھا کہ سائیں بابا ایک موٹر سائیکل پر اڑا جا رہا تھا — اکرام نے اس پر فائر کیا — مگر وہ پستول کی پہنچ سے بہت دور جا چکا تھا۔

"کوئی فائدہ نہیں اکرام۔"

"جیپ پر تعاقب کیوں نہ کریں۔" اکرام نے کہا۔

"جتنی دیر میں ہم جیپ تک پہنچیں گے، وہ کہیں کا کہیں جا چکا ہو گا — آؤ خیمے میں چلیں۔"

وہ ہانپتے ہوئے واپس چل پڑے۔

"کیا ہوا ابا جان — کیا وہ نکل گیا —" فرزانہ نے پوچھا۔ وہ خیمے کے دروازے پر کھڑی تھی — باقی تمام لوگ رفو چکر ہو چکے تھے۔

"ہاں بیٹی! وہ ہم سب سے تیز رفتار نکلا — اور پھر اس نے جھاڑیوں میں موٹر سائیکل چھپائی ہوئی تھی۔"

"ارے!" وہ حیران رہ گئی۔

"اکرام — اب ذرا اس گدڑی کا جائزہ لو۔"

اکرام نے گدڑی اٹھا کر جھاڑ دی — ان کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں — سو سو اور پچاس پچاس کے سینکڑوں نوٹ زمین پر گر پڑے تھے۔

"اُف خدا — اتنی دولت۔"

"اور یہ سب اس نے اس نئی بیماری کا علاج کر کے کمائے ہیں۔"

واپسی کے وقت وہ راکھ کی ڈبیا پر قبضہ کرنا نہیں بھولے تھے۔

محمود اور فاروق کی آنکھ کھلی تو انہوں نے اپنے آپ کو دو کرسیوں میں بندھا ہوا پایا۔ ان کی ٹانگوں کو کرسیوں کی ٹانگوں سے باندھا گیا تھا۔ اسی طرح اوپر کے دھڑ کرسی کے اوپر والے حصے سے بندھے ہوئے تھے۔

"یہ ہم کس مصیبت میں پھنس گئے۔" فاروق نے بے بسی کے عالم میں کہا۔

"اگر ہم رات کے وقت وہاں نہ جاتے تو کسی طرح بھی اتنا بڑا راز معلوم نہ ہوتا۔" محمود بولا۔

"اُف خدا ۔۔۔ وہ آنکھیں کتنی سرخ تھیں ۔۔۔" فاروق کی آنکھوں میں خوف کے سائے لہرا رہے تھے۔

"آنکھوں سے زیادہ وہ کس قدر حیرت ناک تھا جو ہم نے دیکھا۔"

"لیکن ہم پر حملہ کس نے کیا تھا ۔۔۔ وہ تو جیپ میں موجود تھا۔" فاروق نے سوال کیا۔

"اس کا کوئی آدمی جنگل میں چھپا ہوا ہوگا۔"

"ہوں ۔۔۔ اب کیا ہوگا ۔۔۔"

"تمہارا رومال ابا جان کو ضرور ملے گا ۔۔۔ پھر انہیں یہاں تک پہنچنے میں دیر نہیں لگے گی۔"

"خدا کرے ایسا ہی ہو ۔۔۔"

"کیا ہم سارے دن اسی طرح بندھے رہیں گے۔"

"اللہ بہتر کرے گا ۔۔۔ اس پر بھروسہ رکھو۔"

اسی وقت کوئی موٹر سائیکل گھر میں داخل ہوئے اور انجن کے بند ہونے کی آواز سنائی دی۔ پھر کوئی ساتھ والے کمرے میں داخل ہوا۔

"کیا ہوا ۔۔۔ خیر تو ہے۔" کسی نے پوچھا۔

"تم سے کس گدھے نے کہا تھا کہ ان دونوں پر حملہ کر دو۔"

"جی ۔۔۔ رات کے گیارہ بجے ۔۔۔۔ وہ ۔۔۔۔"

"بکو مت ۔۔۔ سب چوپٹ ہو گیا ۔۔۔ جانتے ہو یہ دونوں کون ہیں۔"

"جی ۔۔۔ جی نہیں۔"

"یہ انسپکٹر جمشید کے لڑکے ہیں ۔۔۔ اور اب ہمارے راز سے واقف ہو گئے ہیں ۔۔۔ اب ان کا زندہ رہنا ہمارے لیے نقصان دہ ہے ۔۔۔ اگر انسپکٹر جمشید نے انہیں یہاں سے برآمد کر لیا تو ہم کسی صورت نہیں بچ سکیں گے۔"

"پھر کیا کیا جائے۔"

"ان کو ختم کر دو ۔۔۔ لیکن یہاں نہیں ۔۔۔ یہاں سے دور ۔۔۔ دریا کے کنارے ۔۔۔ ختم کر کے انہیں دریا میں پھینک دینا ۔۔۔ گلا گھونٹ کر مارو ۔۔۔ تاکہ یہ خیال کیا جائے کہ دونوں لڑکے

پانی میں ڈوب کر مرے ہیں۔"

"جی بہت اچھا۔کیا یہ کام اسی وقت کیا جائے۔"

"نہیں——اس وقت تو ہر طرف ان کی تلاش میں پولیس کے سپاہی دوڑتے پھر رہے ہیں——شام چار بجے کے بعد تم انہیں یہاں سے نکال لے جانا——"

"جی بہت اچھا۔"

"اور سنو——تم انہیں یہاں سے کیسے لے جاؤ گے۔"

"جی——کار میں——"

"ہوں——بہت عقل مند ہو تم——تم انہیں کار میں لے جاؤ گے——تاکہ باہر نکلتے ہی پولیس کار کو گھیر لے اور ہم سب پکڑے جائیں۔"

"تو پھر جیسا آپ حکم فرمائیں۔"

"تم ان دونوں کو اندر ہی اندر گیراج میں لے جاؤ گے——اس وقت گیراج کا بیرونی دروازہ بند رکھنا——انہیں اندرونی دروازے میں سے گیراج میں لے جانا——اور ڈکی میں بند کر کے دریا تک لے جانا۔"

"اوہ——بہت خوب——واقعی ترکیبیں سوچنے میں آپ کا جواب نہیں——"

"میرے دماغ میں تمہاری طرح بھوسہ نہیں بھرا ہوا۔اب

تم دونوں جا سکتے ہو——ٹھیک پونے چار بجے یہاں پہنچ جانا۔"

"جی بہتر!"

دونوں نے سہم کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر اوپر کی طرف دیکھنے لگے جیسے کہہ رہے ہوں:

"اللہ مالک ہے۔"

۱۱

"اب ہمارے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ چھاپا مارا جائے۔" انسپکٹر جمشید ڈی آئی جی صاحب سے کہہ رہے تھے وہ انہیں اس وقت تک پیش آنے والے تمام واقعات سنا چکے تھے:

"ٹھیک ہے، مجھے کوئی اعتراض نہیں، لیکن اتنا سوچ لو کہ اگر اس کوٹھی سے کچھ برآمد نہ ہوا تو بڑی بدنامی ہو گی۔"

"محمود اور فاروق کی زندگی کا سوال ہے۔"

"ہاں یہ بھی ٹھیک ہے——محمود اور فاروق مجھے تم سے کچھ کم عزیز نہیں ہیں——میں انہیں اپنی اولاد کی طرح سمجھتا ہوں——ویسے بھی وہ قوم کے ہونہار فرزند ہیں——اس ملک اور قوم کو ایسے ہی ہونہاروں کی ضرورت ہے——تم جو جی میں آئے کرو——جو ہو گا دیکھا جائے گا——"

"جی بہت بہت شکریہ!" انسپکٹر جمشید اُٹھ کھڑے ہوئے۔

"کیا کوٹھی کی نگرانی اس وقت بھی ہو رہی ہے؟"

"جی ہاں — وہ تو کل سے ہو رہی ہے —"

"تو کیا محمود اور فاروق کو وہاں لاتے ہوئے نہیں دیکھا گیا؟"

"یہ رات کے گیارہ بجے کے بعد کا واقعہ ہے — ہو سکتا ہے نگرانی کرنے والوں سے کوئی چوک ہو گئی ہو — کوٹھی کا ایک دروازہ پچھلی طرف بھی ہے — جس کی طرف دھیان آج ہی گیا ہے — مجھے یقین ہے — ان دونوں کو پچھلے دروازے سے اندر لے جایا گیا ہے۔"

"ہوں ٹھیک ہے — میں تمہاری کامیابی کے لیے دعا کروں گا۔"

وہ اپنے کمرے میں آئے تو اکرام نے انہیں بتایا کہ بیگم جمشید کئی بار فون پہ محمود اور فاروق کے متعلق پوچھ چکی ہیں۔

"اور کوئی خبر؟"

"جی نہیں۔"

"ہوں ٹھیک ہے — وہ ماں ہیں بھئی — ان کے دل کو قرار کہاں — اچھا سنو — ہم ایک عدد چھاپا مارنے والے ہیں۔"

"چھاپا — لیکن کہاں؟"

"کل ڈیسنٹ سویٹس فیکٹری کا ملازم جس کوٹھی میں داخل

ہوا تھا — اس پر۔"

"اوہ —" اکرام کے منہ سے نکلا۔

"چھاپا بہت ہی منظم ہو کر مارنا ہے — پوری کوٹھی کو چاروں طرف سے گھیر لیا جائے اور کسی کو گھر سے نکل کر جانے نہ دیا جائے — جو بھی باہر نکلے اسی کو گرفتار کر لیا جائے۔"

"جی بہتر!"

"لیکن — چھاپا مارنے سے پہلے ہمیں ایک کام اور کرنا ہو گا۔"

"جی وہ کیا —"

"چھاپا اس وقت تک نہیں مارا جائے گا جب تک کہ فیکٹری کا ملازم اندر نہ داخل ہو جائے۔"

"جی بہتر!"

"اب تم جا کر چھاپے کی تیاری کرو — میں ذرا گھر ہو آؤں — فرزانہ اور اس کی امی سخت پریشان ہوں گے —"

"جی — ٹھیک۔"

انسپکٹر جمشید اُٹھ کھڑے ہوئے۔

۱۱

شام کے ٹھیک چار بجے فیکٹری کا ملازم اُسی کوٹھی میں

داخل ہوا — اس سے پہلے کوٹھی کو سادہ لباس والوں نے چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔ ڈیسنٹ سوٹیس فیکٹری کے ملازم کو داخل ہوتے دیکھ کر اکرام نے اپنے آدمیوں کو مستعد ہو جانے کا اشارہ کیا — پھر گردن گھما کر کوٹھی سے ذرا فاصلے پر ایک ٹی سٹال کی طرف اشارہ کیا۔

انسپکٹر جمشید اور فرزانہ ٹی سٹال میں بیٹھے تھے۔ اُن کے ساتھ دو اخباری رپورٹر بھی تھے — یہ دونوں انسپکٹر جمشید کے دوست بھی تھے۔

"کیا تم دونوں بالکل تیار ہو —" انسپکٹر جمشید نے اُن سے پوچھا۔

"ہاں!" دونوں بیک وقت بولے۔

"جیسے ہی یہ شخص، جو ابھی ابھی اندر گیا ہے، باہر نکلے، کوٹھی کے دروازے پر ہی اس کی تصویر اُتار لینا۔"

"ٹھیک ہے — ایسا ہی ہو گا —" ان میں سے ایک نے کہا۔

"تو پھر آؤ — کوٹھی کے دروازے کے پاس چلیں۔" انسپکٹر جمشید اُٹھ کھڑے ہوئے۔

"تم نے بتایا نہیں — آخر چکر کیا ہے — کیا تمہارا خیال ہے کہ اس کوٹھی میں سے محمود اور فاروق برآمد ہو جائیں گے۔"

ایک نے پوچھا۔

"ہاں کمال صاحب — بس دیکھتے جاؤ۔"

"دیکھ تو ہم رہے ہی ہیں — چاروں طرف سادہ لباس والے پھیلے ہوئے ہیں — کیوں ظفر۔" کمال نے اپنے ساتھی سے کہا۔

"بالکل —"

چاروں ٹی سٹال سے نکل آئے تھے اور کوٹھی کے دروازے کی طرف بڑھ رہے تھے، اچانک انہوں نے فیکٹری کے ملازم کو باہر نکلتے دیکھا اور جلدی جلدی اس کی تصویریں لے لی گئیں — اسی وقت اکرام اس کی طرف بڑھا:

"ڈیسنٹ سوٹیس فیکٹری کے ایک ملازم کا یہاں کیا کام۔" اس کے منہ سے نکلا۔ وہ چونک اٹھا — اور گھبرا کر دائیں بائیں دیکھنے لگا۔ اسی وقت انسپکٹر جمشید بھی دوسروں کے ساتھ وہاں پہنچ گئے۔

"کیا بات ہے اکرام؟"

"سر! یہ کوٹھی مشتبہ لوگوں کے استعمال میں ہے — ہم اس کی نگرانی کر رہے ہیں۔ اسے تو آپ پہچانتے ہی ہوں گے — ڈیسنٹ سوٹیس فیکٹری میں کام کرتا ہے — مجھے حیرت ہے کہ یہ یہاں کس لیے آیا تھا۔"

"ٹھیک ہے — تم اس کی تلاشی لو۔"

"میری جیبوں میں کچھ بھی نہیں ہے۔" وہ گڑبڑا گیا۔

"ہم بھی دیکھنا چاہتے ہیں۔" اکرام اس کی طرف بڑھا ہی تھا کہ وہ بھڑک کر بھاگا — لیکن فوراً ہی دو سادہ لباس والوں نے اسے دونوں طرف سے تھام لیا۔

"میرا خیال ہے اب تم آرام سے تلاشی دو گے۔"

اکرام اس کی تلاشی لینے لگا — کمال اور ظفر تصویریں اتارنے میں مصروف تھے۔ دوسرے ہی لمحے وہ سب حیران رہ گئے۔ اکرام کہہ رہا تھا:

"اس کی جیبوں میں تو کچھ بھی نہیں ہے سر!"

"کیا کہا — بالکل کچھ نہیں ہے؟"

"جی ہاں — سوائے چاکلیٹوں کے ایک ڈبے کے۔"

"تو پھر اور ہمیں چاہیے کیا —" انسپکٹر جمشید خوش ہوئے۔

اکرام نے اس کی جیب سے ڈبہ نکال لیا —

"اس کے ہتھکڑیاں لگا دو۔" انسپکٹر جمشید نے حکم دیا —

"اور کوٹھی کے بالکل نزدیک چلے آؤ —"

"کیا میں دروازے پر دستک دوں۔" اکرام نے پوچھا۔

"ہاں!"

اکرام نے کوٹھی کے دروازے پر گھنٹی کا بٹن دبا دیا۔

۶

محمود اور فاروق کا بھوک کے مارے بُرا حال تھا — وہ ابھی تک کرسیوں سے بندھے ہوئے تھے۔ ظالموں نے ایک بار بھی ان کی خبر نہیں لی تھی، اور نہ کچھ کھانے کو دیا تھا — اچانک دروازہ کھلا اور دو لمبے تڑنگے آدمی اندر داخل ہوئے اُن کے چہرے حد درجے خوفناک تھے — آنکھیں ڈراؤنی تھیں۔

انہوں نے اندر آتے ہی خاموشی سے ان کی رسیاں کھولنی شروع کر دیں، جب رسیاں کھُل گئیں تو ایک سرد لہجے میں بولا —

"چلو اُٹھو —"

دونوں خاموشی سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ انہوں نے ایک دوسرے کی طرف بے چارگی سے دیکھا اور دروازے کی طرف بڑھے — اس وقت دونوں کے ذہن کند ہو گئے تھے — کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کریں — اس وقت انہیں فرزانہ بُری طرح یاد آئی — اگر وہ بھی یہاں موجود ہوتی تو ضرور کوئی نہ کوئی گل کھلاتی — فرزانہ کا خیال آتے ہی فاروق کا ذہن جاگ اٹھا — بہن کی محبت نے جوش مارا — ساتھ ہی ابا جان اور امی جان کی تصویریں آنکھوں کے سامنے رقص کرنے لگیں:

"تم ہمیں کہاں لے جانا چاہتے ہو——" اچانک اس کی زبان چلنے لگی۔

"موت کی وادی میں۔" ان میں ایک نے ہنس کر کہا۔

"یہ کس جگہ واقع ہے۔" فاروق اور محمود نے چونک کر رکنے کی کوشش کی۔

"چلو چلو——رکو نہیں——ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔"

"تم نے بتایا نہیں——کہاں لے جانا چاہتے ہو ہمیں۔" فاروق نے پھر پوچھا۔

"بتایا تو ہے——موت کی وادی میں۔"

"اور یہ وادی کہاں ہے۔" فاروق نے پھر پوچھا۔

"ابھی معلوم ہو جائے گا۔"

"ہم نے تمہارا کیا بگاڑا ہے۔" محمود بول اٹھا۔

"ابھی تو کچھ نہیں بگاڑا——البتہ اگر ہم تمہیں زندہ چھوڑ دیں گے تو ضرور اپنا سب کچھ بگاڑ لیں گے۔"

"آخر تم لوگ چاہتے کیا ہو۔" فاروق نے جھنجھلاہٹ کا مظاہرہ کیا۔

"چلتے رہو۔"

"چل تو رہے ہیں۔"

"تیز تیز چلو——

صبح سے بھوکے ہیں۔ کچھ کھانے کو دو تو تیز تیز بھی چل سکیں گے۔"

"تمہیں صرف گیراج تک جانا ہے——کوئی دو چار میل پیدل نہیں چلنا ہے۔"

"ارے! صرف گیراج تک——" محمود نے حیرت کا اظہار کیا۔

"ہاں——"

"اور اس کے بعد؟" فاروق نے پوچھا۔

"اس کے بعد ہم تمہیں کار کی سیر کرائیں گے۔"

"بہت خوب——تم لوگ تو بہت اچھے ہو——" محمود نے خوش ہو کر کہا۔

"لیکن بہتر ہوتا کہ سیر سے پہلے تم ہمیں کچھ کھلا پلا دیتے——اس طرح سیر کا لطف نہیں آئے گا۔"

"بس خاموش——تمہاری منزل قریب آگئی۔"

"تو کیا منزل کے قریب بولنا گناہ ہے۔" فاروق نے پوچھا۔

ان میں سے ایک گیراج کا دروازہ کھولنے کے لیے آگے بڑھا——یہ دروازہ مکان کے اندر تھا۔ محمود نے فاروق کی طرف دیکھ کر اشارہ کیا کہ یہی وقت ہے کچھ کرنے کا۔ دفعتاً دونوں پاس کھڑے ہوئے آدمی پر ٹوٹ پڑے۔ وہ اس حملے کے لیے تیار نہ تھا——لڑکھڑا گیا——محمود نے پیچھے ہٹ کر سر کی ایک زوردار

ٹکر اس کے پیٹ میں ماری ——— اور وہ زمین پر گر پڑا ——— اتنی دیر میں دوسرا آدمی ہوشیار ہو چکا تھا اور گیراج کا دروازہ کھُل چکا تھا ——— وہ سیدھا ان کی طرف لپکا ——— اسی وقت دوسرا بھی اٹھ کھڑا ہوا ——— دونوں نے ان کو بازوؤں میں جکڑ لیا ——— عین اس وقت فاروق کے ذہن میں ایک خیال بجلی کی مانند آیا ——— اس نے بدمعاش کے بازوؤں میں جھول کر اپنی ٹانگوں کو زور سے جھٹکا دیا۔

اسی وقت ایک آدمی وہاں آیا ——— اور آتے ہی بولا۔

"جلدی کرو ——— دروازے پر انسپکٹر جمشید اور اس کے ساتھی پہنچ چکے ہیں۔ کار سیدھی نکال لے جانا ——— جلدی کرو ٹھونس دو ——— ان کو ڈکی میں۔"

نقلی چہرہ

اکرام نے ایک بار پھر گھنٹی بجائی۔ چند لمحوں بعد ایک میلے کچیلے کپڑوں میں ملبوس ملازم دروازے پر نمودار ہوا۔

"صاحب آ رہے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ دروازے میں سے باہر نکل آیا اور گیراج کے دروازے کی طرف بڑھا ——— انسپکٹر جمشید اسے بغور دیکھ رہے تھے۔ اس نے نیچے جھک کر ٹین کا دروازہ اوپر اٹھایا ——— دروازہ زور دار آواز کے ساتھ کھلا۔ ساتھ ہی ایک کار گیراج سے باہر نکلی ——— اکرام نے سیٹی منہ سے لگا کر بجا دی ——— آناً فاناً میں کار کے سامنے پانچ چھ کانسٹیبل دیوار بن کر کھڑے ہو گئے ——— اکرام کار کی طرف بڑھا ——— اس میں دو آدمی بیٹھے تھے۔

"آپ حضرات کہاں تشریف لے جا رہے ہیں۔" اس نے نرمی سے پوچھا۔

"جی ——— کار میں پٹرول ڈلوانا ہے۔"

"اوہ ——— اچھا ——— کیا آپ ہی اس کوٹھی کے مالک ہیں؟"

"جی نہیں ——— صاحب اندر ہیں۔"

"بہت خوب تو آپ دونوں کار سے باہر تشریف لے آئیں۔"
یہ کہہ کر اکرام نے پستول نکال لیا۔

مجبوراً وہ کار سے باہر نکل آئے۔

"ہتھکڑیاں!" اکرام نے کہا۔ دونوں کے بھی ہتھکڑیاں لگا دی گئیں۔

"یہ سب کیا ہے ــــ" ان میں سے ایک بولا۔

"وہی سب کچھ ــــ جو تم جانتے ہی ہو۔"

اسی وقت دروازہ کھلا اور ڈاکٹر ادریس دروازے پر آیا۔ انہیں دیکھ کر چونکا:

"آپ ــــ میرا خیال ہے ــــ میں نے آپ کو کہیں دیکھا ہے۔" اس نے انسپکٹر جمشید سے کہا۔

"جی ہاں! ابھی دو تین دن پہلے ہم ایک لڑکے کو لے کر آپ کے پاس آئے تھے، اس کے ہاتھ پیر مڑ گئے تھے ــــ پروفیسر داؤد ہمارے ساتھ تھے۔"

"اوہ! یاد آیا..... آپ انسپکٹر جمشید ہیں ــــ ارے! تم دونوں ابھی گئے نہیں ــــ جلدی کرو پٹرول ڈلوا کر لاؤ..... ہائیں ــــ یہ تمہارے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں کیسی ہیں ــــ یہ کیا ماجرا ہے ــــ انسپکٹر صاحب کیا یہ ہتھکڑیاں آپ نے لگائی ہیں۔"

"جی ہاں!"

"لیکن ــــ یہ دونوں تو میرے ملازم ہیں ــــ انہوں نے کیا کیا ہے۔"

"بہت خوب ــــ ڈاکٹر صاحب ــــ ہم دراصل آپ کی کوٹھی کی تلاشی لینے آئے ہیں۔"

"کیا کہا ــــ میری کوٹھی کی تلاشی ــــ"

"جی ہاں ــــ"

"لیکن کیوں ــــ اور کیا آپ کے پاس وارنٹ ہیں۔"

"جی ہاں ــــ یہ رہے۔"

"آپ تلاشی کیوں لینا چاہتے ہیں ــــ"

"ابھی معلوم ہو جائے گا ــــ اکرام تم ڈاکٹر ادریس کے بھی ہتھکڑیاں لگا دو۔"

"جی!" اکرام حیران رہ گیا۔

"ہاں ہاں ــــ لگا دو۔"

"لیکن کس جرم میں۔" ڈاکٹر ادریس نے تیز لہجے میں کہا۔

"جرم بھی بتا دوں گا۔"

اکرام نے اس کے بھی ہتھکڑی لگا دی۔ اس کے بعد وہ سب کوٹھی میں داخل ہوئے۔

"پوری کوٹھی کی تلاشی لو ــــ" اکرام نے اپنے ماتحتوں سے کہا۔ وہ خود بھی انسپکٹر جمشید کے ساتھ تلاشی لینے کے لیے آگے

پڑھا۔

"محمود اور فاروق کہاں ہیں؟" انسپکٹر جمشید نے ڈاکٹر ادریس سے پوچھا۔

"کون محمود ۔۔۔ فاروق ۔۔۔"

"وہی دونوں لڑکے ۔۔۔ جنہیں رات گیارہ بجے اٹھا کر یہاں لایا گیا ہے۔"

"تو کیا اسی جرم کی پاداش میں ہتھکڑیاں لگائی گئی ہیں؟" ڈاکٹر ادریس نے پوچھا۔

"ہاں!"

"تب پھر میں بہت جلد تم پر ہتک عزت کا دعویٰ کروں گا ۔۔۔ یہاں کوئی لڑکا نہیں ہے۔"

"لیکن میں دونوں بچوں کو یہاں سے ہی برآمد کروں گا۔"

"ضرور کوشش کر دیکھو۔"

پوری کوٹھی چھان ماری گئی لیکن محمود اور فاروق کہیں نہ ملے۔ کانسٹیبلوں نے آ آ کر انکار میں سر ہلائے۔ انسپکٹر جمشید ٹہلتے ہوئے گیراج کے اندرونی دروازے کی طرف بڑھنے لگے ڈاکٹر ادریس بھی دو کانسٹیبلوں کے ساتھ ان کے پیچھے تھا۔ اخباری رپورٹر بھی ساتھ تھے۔

دفعتاً فرزانہ جھکی اور فرش سے کوئی چیز اٹھا لی۔

"فاروق کا جوتا!" اس کے منہ سے نکلا۔

"کیا!" اکرام کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

"ہاں ۔۔۔ مجھے ایک ہزار فیصد یقین ہے کہ یہ جوتا فاروق کا ہے ۔۔۔ کیوں ڈاکٹر اس جوتے کا یہاں کیا کام؟"

"مجھے نہیں معلوم ۔۔۔ یہ یہاں کیسے آیا۔"

"بہت خوب ۔۔۔ اکرام ۔۔۔ اب میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ دونوں بچے کار کی ڈکی میں ہیں۔"

"کیا!" کئی ایک کے منہ سے نکلا۔ کمال اور ظفر کی آنکھیں حیرت سے کھل گئیں۔

"ہاں! جلدی کرو ۔۔۔ کہیں ان کے دم نہ گھٹ جائیں۔"

سب گھبراہٹ کے عالم میں باہر آئے۔ کار میں سے چابیاں لے کر ڈکی کو کھولا گیا تو اندر محمود اور فاروق نیم بے ہوشی کی حالت میں تھے۔ گھٹن کی وجہ سے ان کی یہ حالت ہو گئی تھی۔

"اور اب ۔۔۔ جب کہ تم پر یہ جرم ثابت ہو گیا ہے ۔۔۔ میں تم پر شہر میں ایک مصنوعی بیماری پھیلانے کا جرم بھی عائد کرتا ہوں ...."

"مصنوعی بیماری!" کئی آوازیں ابھریں۔ محمود اور فاروق ہوش میں آتے جا رہے تھے۔

"ہاں ۔۔۔ یہ جراثیم کا ماہر ہے ۔۔۔ کسی تجربے کے دوران

اس بیماری کے جراثیم دریافت ہو گئے — اس نے ان کی پرورش کے سلسلے میں تجربات کیے اور کامیاب ہو گیا — جب جراثیموں کی تعداد بڑھنی شروع ہو گئی تو ان جراثیموں کو کئی جانوروں پر آزمایا — نتیجے کے طور پر ان کے پیر مڑ گئے — پھر ان جراثیموں پر مختلف قسم کی دوائیں آزمائیں — ایک دوا سے جراثیم ہلاک ہو گئے — وہ دوا اُن جانوروں کو کھلائی گئی تو وہ فوراً ٹھیک ہو گئے — اس نے دوا کو سفوف کی شکل میں تیار کر لیا — یہ سفوف بالکل راکھ کی شکل کا تیار ہوا — یہاں سے اس کے مجرمانہ ذہن میں دولت سمیٹنے کی ایک عجیب و غریب ترکیب آئی — اس نے ڈیلیشنٹ سوئیس فیکٹری کے دو ملازموں کو بھاری لالچ دے کر اپنے ساتھ ملا لیا — ان میں سے ایک کو ہم ابھی ابھی پکڑ چکے ہیں — دوسرا گیٹ کیپر ہے، جو ملازموں کی باہر نکلتے ہوئے تلاشی لیتا ہے — اسے بھی گرفتار کرنا ہے — ان دونوں کے ذریعے سے یہ ہر روز چاکلیٹ کا ایک ڈبہ منگوانے لگا — جب ڈبہ اسے مل جاتا تو یہ ان چاکلیٹوں میں جراثیم داخل کر دیتا — اگلے دن ملازم ان چاکلیٹوں کو مختلف ڈپوں میں تقسیم کر دیتا — اور اس طرح یہ چاکلیٹ شہر کے مختلف حصوں میں پہنچنے لگے — چاکلیٹ مہنگی چیز ہے۔ اسے امیر بچے ہی کھا سکتے ہیں اس لیے جتنے بھی بچے بیمار ہوئے سب

والدین دولت مند تھے — اب اس نے ایک سائیں بابا تیار کیا — جو اُن بچوں کو اُس کی تیار کردہ دوا راکھ کی چٹکی کی صورت کھلا سکے۔"

"لیکن لوگوں کو کیسے پتا چلا کہ فلاں سائیں بابا اس عجیب غریب بیماری کا علاج کرتا ہے —" فرزانہ نے پوچھا۔

وہ سب ڈرائنگ روم میں بیٹھے انسپکٹر جمشید کی تقریر محویت سے سُن رہے تھے۔

"یہ بہت آسان کام تھا — جس دن پہلا بچہ بیمار ہوا، اس کے متعلق اخبار میں خبر شائع ہوئی اور یہ بات بھی کہ ڈاکٹر اس کا علاج کرنے میں ناکام رہے ہیں — بس پھر — اس کا ایک آدمی وہاں پہنچ گیا۔ اور اس بچے کے والدین کو بتایا کہ اکبر روڈ پر جنگل میں ایک سائیں بابا بیٹھتا ہے — اس نے اس بیماری کا علاج اس کی آنکھوں کے سامنے کیا ہے — پریشان والدین بچے کو وہاں لے گئے۔ بچہ ٹھیک ہو گیا — اور یہ خبر پورے شہر میں گشت کرنے لگی کہ بڑے بڑے ڈاکٹر جس بیماری کا علاج نہ کر سکے — ایک اللہ والے نے اسے دیکھتے ہی دیکھتے بھلا چنگا کر دیا — ڈاکٹر ادریس کی تجربہ گاہ سے وہ جراثیم ثبوت کے طور پر حاصل کیے جا سکتے ہیں — اور علاج کے لیے جو دوا استعمال کی جاتی تھی — وہ پہلے ہی ہمارے قبضے میں ہے۔"

"لیکن ——وہ سائیں بابا کہاں غائب ہو گیا ——"

"وہ ان دونوں بدمعاشوں میں سے ہی کوئی ہو گا ——" انسپکٹر جمشید بولے۔

"ان کے خلاف بہت بڑے بڑے ثبوت موجود ہیں۔ اب مزید کسی ثبوت کی ضرورت نہیں۔" اخباری رپورٹر کمال نے کہا۔

"لیکن پہلے جراثیم والی شیشی تو حاصل کر لینی چاہیے۔"

"اس کے لیے ہم کسی جراثیم کے ڈاکٹر کی خدمات حاصل کریں گے ——وہ شیشی ہمیں نہیں ملے گی۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"یہ بھی ٹھیک ہے۔" ظفر بولا۔

"تو کیا اب انہیں لے چلیں۔" اکرام نے پوچھا۔

"تم میں سے سائیں بابا کا روپ کس نے دھارا تھا۔" انسپکٹر جمشید نے اکرام کے سوال کو نظر انداز کر کے پوچھا۔

"ہم دونوں میں سے تو کسی نے بھی نہیں دھارا۔" ایک بولا۔

"تو پھر سائیں بابا کون تھا ——کیا وہ کوئی اور تھا ——اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں اسے بھی تلاش کرنا پڑے گا ——" اکرام نے کہا۔

"جی نہیں ——اسے تلاش کرنے کی ضرورت نہیں ——" فاروق بول اٹھا۔

"کیا مطلب؟" اکرام نے پوچھا۔

"کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ ہمیں اغوا کیوں کیا گیا تھا۔"

"ہم خود حیران ہیں ——کہ اس کی کیا ضرورت تھی۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"اس کی ضرورت تھی ——جب ہم خیمے کے دروازے پر پہنچے اور پردے کو سرکا کر اندر جھانکا تو جانتے ہیں ہم نے اندر کیا دیکھا تھا۔"

"کیا دیکھا تھا؟" کئی ایک کے منہ سے نکلا۔

"سائیں بابا اپنا چہرہ اتار رہے تھے۔" محمود بولا۔

"چہرہ اتار رہے تھے ——" ان کے منہ حیرت سے کھلے کے کھلے رہ گئے۔

"جی ہاں ——ایک مصنوعی چہرہ ——جو وہ اپنے چہرے پر سجائے رہتے تھے۔" محمود نے بتایا۔

"آپ نے مہدی حسن کا وہ گانا تو ضرور سنا ہو گا ——ایک چہرے پہ کئی چہرے سجا لیتے ہیں لوگ۔" فاروق بول اٹھا۔

سب لوگ ہنس پڑے۔

"تو بس ——بالکل وہی معاملہ اس وقت ہماری آنکھوں کے سامنے تھا —— چہرے کا ایک خول سا تیار کیا ہوا تھا ——جس پر لمبی سی داڑھی بھی تھی ——اور جھریاں بھی پڑی تھیں۔"

"کمال ہے۔" کمال کے منہ سے نکلا۔

"اور اہم بات تو تم نے بتائی ہی نہیں — نقلی چہرہ کون اپنے اصلی چہرے پر سجاتا تھا۔" فاروق نے مسکرا کر کہا۔

"یہ —" محمود نے ڈاکٹر ادریس کی طرف انگلی اٹھا کر کہا۔

"کیا —؟" وہ سب چونک اٹھے۔

"ہاں — جونہی ہم نے اسے دیکھا — یہ گھبرا گیا — ساتھ ہی اس کے آدمیوں نے ہمارے سروں پر کوئی چیز دے ماری۔" محمود نے اپنے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا — وہاں ایک اور چھوٹا سا سر نمودار ہو چکا تھا — فاروق کا بھی یہی حال تھا۔

"تب تو وہ نقلی چہرہ بھی یہیں کہیں ہو گا —" اکرام بولا۔

"ہاں — ڈاکٹر ادریس کی میز کی دراز میں دیکھو۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

جلد ہی اکرام سائیں بابا کا چہرہ لیے اندر داخل ہوا۔ اسے ڈاکٹر ادریس کے چہرے پر لگا کر دیکھا گیا تو بالکل فٹ آیا۔

"لیجیے — سائیں بابا تیار ہے۔" فاروق کے اس جملے پر سب قہقہہ مار کر ہنسے۔

کمال اور ظفر جھٹ پٹ تصویریں اتار رہے تھے —

دوسرے دن کے اخبارات نے شہر میں ہل چل سی مچا دی۔ تمام اخبارات نے پہلے صفحے پر محمود، فاروق، فرزانہ اور انسپکٹر جمشید کی تصویریں شائع کیں۔ ان کے ساتھ ڈاکٹر ادریس

اور سائیں بابا کی تصویریں بھی تھیں — ایک طرف نقلی چہرے کی تصویریں بھی لگائی گئی تھیں — جسے لوگ جوش و خروش کے عالم میں دیکھ رہے تھے۔

پُراسرار ناول

O

ہر ناول میں ایک سنسنی خیز واقعہ اور درد ناک کہانی

ناول	مصنف	قیمت
دھوئیں کی مخلوق	ذوالفقار احمد تابش	۳/۷۵
سارنگ بابا اور جل پری	اے۔ حمید	۳/-
ڈوبے جہاز کا راز	اے۔ حمید	۳/-
خلا میں جنگ	اے۔ حمید	۳/-
جادوگر جاسوس	آغا اشرف	۳/۵۰
وحشت ناک چہرہ	آغا اشرف	۳/-
بھوتوں کا راز	جبار توقیر	۳/۵۰
وہ بے گناہ تھا	اے۔ حمید	۳/-
امجد کا اغوا	اے۔ حمید	۳/۵۰
شیشے کا بکس	اشتیاق احمد	۳/۵۰
دوستوں کا کارنامہ	ریاض احمد	۵/-
آدھی رات	جبار توقیر	۴/۵۰
ایک لڑکا ایک ڈاکٹر	جبار توقیر	۳/۵۰
غار میں چیخ	اے۔ حمید	۳/-

شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز۔ لاہور۔ حیدر آباد۔ کراچی

دلچسپ ناول

یہ ناول انتہائی دلچسپ اور ملک کے مشہور ادیبوں نے نہایت محنت سے انہیں ناول کے روپ میں پیش کیا ہے — ہر ناول کا پلاٹ انوکھا ہے!

ناول	مصنف	قیمت
خونی رومال	اے۔ حمید	۳/-
کھلاڑی	ریاض احمد	۳/۷۵
چور اچکا چودھری	جبار توقیر	۵/-
جاں نثار نواب	رحیم	۳/۵۰
قسمت کا سوداگر	محمد یونس حسرت	۳/-
ڈاک بنگلہ کا پاگل ہاتھی	اے۔ حمید	۳/-
کالا شیر	اختر ملیح آبادی	۳/۷۵
دولت پور کا چور	محمد یونس حسرت	۳/۵۰
ایک مکان دو دیواریں	کمال احمد رضوی	۳/-
ایک ننھا لڑکا	الطاف فاطمہ	۳/۷۵
گولر کا پھول	شوکت تھانوی	۳/-
زمرد محل	کمال احمد رضوی	۲/-
سونے کا گدھا	عشرت رحمانی	۳/-

شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز، لاہور۔ حیدر آباد۔ کراچی

مہمّاتی ناول

ہر ناول کی کہانی الگ تھلگ • خوفناک مناظر سے آراستہ

• گمنام قبیلے کا راز	مُحمّد عظیم	۳/۷۰
• آدم خوروں کا جزیرہ	حسن اکبر کمال	۳/۷۵
• طلسمی جنگل	ریاض احمد	۴/۵۰
• جانی چور کے کارنامے	محمد یونس حسرت	۳/-
• جانی چور کی واپسی	محمد یونس حسرت	۳/-
• عقل مند شکاری	محمد یونس حسرت	۳/۵۰
• خوف ناک سازش	محمد یونس حسرت	۳/-
• پُراسرار چیتا	محمد یونس حسرت	۳/-
• اور میں زندہ رہا	جبّار توقیر	۳/-
• رنگون سے فرار	اے۔حمید	۳/-
• سگنل کی سُرخ بتی	اے۔ حمید	۳/-
• چاند تارا	لطیف فاروقی	۳/-
• جہاں گشت بغدادی	اسرار زیدی	۳/۵۰
• تہ خانے کا راز	اشتیاق احمد	۳/-

شیخ غلام علی اینڈ سنز، پبلشرز۔ لاہور۔ حیدرآباد۔ کراچی

موت کا تعاقب
پوری تاریخ عالم سے ترتیب دیے ایک ایک واقعہ پر پورے ناول کے انداز میں۔ واقعات نہایت دلچسپ و حیرت انگیز۔ اے حمید صاحب ناول لکھ چکے ہیں اور ابھی صرف ۱۰ حصوں تک چھپے ہیں۔ انشاء اللہ جلد ہی باقی حصے بھی ساتھ ساتھ شائع ہوتے رہیں گے۔
۱ — مصر کی ملکہ صفحات ۱۳۶ قیمت ۳/۵۰
۲ — فرعون کی تباہی " ۱۴۰ " ۳/۵۰
۳ — پھانسی کے تختے پر " ۱۶۰ " ۴/۰
۴ — شہزادے کا اغوا " ۱۴۸ " ۳/۷۵
۵ — روحوں کا شہر " ۱۴۴ " ۳/۵۰
۶ — ہڑپہ کا شیش ناگ " ۱۴۸ " ۳/۵۰
۷ — زہر کا پیالہ " ۱۴۴ " ۳/۵۰
۸ — مُردوں کی سرائے " ۱۵۶ " ۴/۰
۹ — مکڑے کا جال " ۱۶۴ " ۴/۰
۱۰ — مَیں سانپ ہوں " ۱۳۲ " ۳/۵۰
انتہائی دلچسپ، عبرت ناک اور سچے واقعات